اصلاحِ معاشرہ
اور
تعمیرِ سیرت و اخلاق
تالیف
مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد
وخلیفہ مجاز:
عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب مدظلہم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصلاحِ معاشرہ اور تعمیرِ سیرت واخلاق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصلاحِ معاشرہ
اور
تعمیرِ سیرت واخلاق

تالیف:

مولانا ڈاکٹر محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب

مهتمم وشيخ الحديث

جامعه عربيه امداديه مرادآباد

وخلیفہ مجاز: عارف باللہ حضرت مولانا

شاه حكيم محمد **اختر** صاحب مدظلهم

Mob`ile: **09412866177**

ناشر:

مركز الكوثر التعليمي والخيرى

مرادآباد

تفصیلات

نام کتاب : اِصلاح معاشرہ اور تعمیرِ سیرت و اخلاق

تالیف : مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی صاحب
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

طبع اول : ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۰۰۷ء

طبع دوم : ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰۱۱ء

طبع سوم : ربیع الاول ۱۴۳۷ھ مطابق جنوری ۲۰۱۶ء

کمپیوزنگ : محمد اسجد قاسمی مظفرنگری

صفحات : ۱۶۰

باہتمام : مرکز الکوثر التعلیمی والخیری مرادآباد

ناشر : فرید بک ڈپو دہلی

قیمت :

ملنے کے پتے:

جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد یوپی

فرید بک ڈپو دہلی

کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

مکتبہ الفرقان لکھنؤ

اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی

مرکز دعوت وارشاد دارالعلوم الاسلامیہ بستی یوپی

مولانا عبدالسلام خان قاسمی 179 کتاب مارکیٹ، وزیر بلڈنگ، بھنڈی بازار ممبئی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مندرجات

مقدمہ (طبع سوم)

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم، اما بعد !

موجودہ پرفتن ماحول میں ہمارا مسلم معاشرہ انحراف اور بگاڑ کے دلدل میں پھنستا چلا جارہا ہے، دینی شعور کے فقدان، صحیح تعلیم اور تربیت کی کمی، مخربِ اخلاق چیزوں کے فروغ اور بے راہ روی نے ہمارے نوجوانوں کو بگاڑ کی آخری حد کے قریب پہنچادیا ہے، اس صورتِ حال پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔

یہ کتاب معاشرتی بگاڑ کی چوطرفہ چھائی ہوئی ظلمتوں میں صلاح اور اصلاح کا ایک دِیا اور چراغ جلانے کی طالب علمانہ کوشش ہے، اور اس میں کم وبیش تمام ضروری موضوعات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن الحمد للہ مقبول ہوا، اب یہ دوسرا ایڈیشن پیش کیا جارہا ہے، راقم کوشش کے باوجود مصروفیات کی بنیاد پر اس میں حذف واضافہ کا عمل انجام نہیں دے سکا، تاہم بحالتِ موجودہ بھی اس کی اشاعت انشاء اللہ افادیت کی حامل ہوگی۔

خداوند قدوس اس کتاب کو قبول فرمائے، اور اسے راقم اور پورے معاشرہ کی اصلاح کا ذریعہ بنائے، آمین۔

محمد اسجد قاسمی، ندوی

خادم الحدیث النبوی الشریف جامعہ عربیہ امدادیہ مرادآباد

یکم ربیع الاول ۱۴۳۷ھ، مطابق ۱۳؍دسمبر ۲۰۱۵ء

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام علی سید المرسلین، وعلی آله واصحابه اجمعین. اما بعد!

زیرِنظر کتاب اصلاحِ معاشرہ اور تعمیرِ سیرت واخلاق سے متعلق فکر انگیز مضامین کا بیش قیمت مجموعہ ہے، ان تمام مضامین میں قدرِ مشترک جذبۂ اصلاح ہے، اور مقصد یہی ہے کہ خلقِ خدا ان کی روشنی میں اپنے روز وشب کا احتساب کرے اور جہاں جہاں بگاڑ در آیا ہے اسے دور کرنے کے لئے سرگرمِ عمل ہو جائے۔

ناچیز پر خداوند قدوس کے فضل کی انتہا نہیں کہ اس نے ٹوٹی پھوٹی ہی سہی زبان وقلم سے خدمتِ دین کی راہ پر لگا دیا ہے، اللہ اس میں خلوص کے رنگ بھر دے اور تاحیات یہ خدمت اپنی توفیقِ خاص سے لیتا رہے، حقیقت یہی ہے کہ ؎

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

محمد اسجد قاسمی، ندوی

خادم الحدیث النبوی الشریف جامعہ عربیہ امدادیہ مراد آباد

۱۵؍ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ

اپنی فکر میں لگے رہو

قرآن کریم اور احادیثِ نبویہ کے نصوص میں یہ حقیقت بار بار بیان کی گئی ہے کہ ہر انسان کو سب سے پہلے، سب سے زیادہ اور سب سے بڑھ کر اپنی اصلاح اور درستگی اور اپنی سیرت کی تعمیر پر توجہ دینی چاہیئے، اس موضوع کی سب سے واضح آیت یہ ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَیْتُمْ، اِلَی اللّٰہِ مَرْجِعُکُمْ جَمِیْعاً فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ.

(المائدة: ۱۰۵)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنی ہی فکر میں لگے رہو، کوئی بھی گمراہ ہو جائے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں، جب کہ تم راہ پر چل رہے ہو، اللہ ہی کی طرف تم سب کی واپسی ہے، سو وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔

واضح فرما دیا گیا ہے کہ ہر وقت دوسرے کے اعمال کی برائیوں، دوسرے کے عقائد کی خرابیوں پر نظر رکھنے کے بجائے خود اپنے افعال واعمال، کردار و سیرت، اخلاق واقوال، افکار وخیالات کو خرابی اور برائی سے بچانے کی فکر وسعی ہونی چاہیئے، انسان کو ہمہ وقت اپنی ذات کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیئے کہ وہ خدا اور بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر انسان میں یہ احساس وفکر پیدا ہو جائے تو وہ کامیاب ہے، کسی کی گمراہی اس کے لئے شمّہ برابر بھی ضرر رساں نہیں ہو سکتی، آیت میں ہر فردِ بشر کو یہ حکم ہے کہ وہ دوسروں کی فکر میں حد سے زیادہ نہ گھلے، اپنی فکر مقدم رکھے، اپنے دین کے تقاضوں اور مطالبوں کو پورا کرے، ہر انسان سے اس کے اپنے اعمال واحوال ہی کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

بقول مولانا دریابادیؒ:

''آیت میں ایک زبردست اصول یعنی شخصی ذمہ داری کا اثبات ہے اور ان لوگوں کا ابطال ہے جو انفرادیت کو اجتماعیت میں گم رکھنا چاہتے ہیں''۔ (تفسیر ماجدی: ۱/ ۴۷۹)

اسی مضمون کو دیگر آیات میں بھی واضح فرمایا گیا ہے، چند آیات ملاحظہ ہوں:

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ، اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّا اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ. (یونس/ ۴۱)

ترجمہ: اگر یہ آپ کو جھٹلاتے ہیں تو کہہ دیجئے کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو، اور جو کچھ تم کررہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ، فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ. (النور/ ۵۴)

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اللہ ورسول کے تابع فرمان بن کر رہو، لیکن اگر وہ رخ پھیرلیں تو وہ خوب سمجھ لیں کہ رسولؐ پر جس فرض کا بار رکھا گیا ہے اس کے ذمہ دار رسول ہیں، اور تم پر جس فرض کا بار ڈالا گیا ہے اس کے ذمہ دار تم ہو''

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

مَنْ قَالَ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ. (مسلم شریف)

ترجمہ: جو یہ کہتا ہے کہ لوگ ہلاک و برباد ہوگئے وہ سب سے زیادہ ہلاک و برباد ہونے والا ہے۔

یعنی جس کا کام اپنے اعمال کی فکر کے بجائے محض دوسروں کی فکر، دوسروں پر تبصرہ، دوسروں کی حالت زار کا تذکرہ اور ہمہ وقت لوگوں کی تباہی وخرابی کا بیان ہو وہ خود سب سے بدتر حالت میں ہے، اسے اپنے گریبان میں جھانک کر اپنی اصلاح کی فکر پہلے کرنی چاہئے۔

سورۃ المائدہ کی مذکورہ آیت کی تفسیر میں مولانا آزادؒ نے ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

''اگر لوگ گمراہ ہوجائیں تو ان کی گمراہی تمہارے لئے دلیل وحجت نہیں ہوسکتی کہ تم کہو! سب گمراہ ہورہے ہیں تو اکیلی جان ہم کیا کریں، ہر آدمی پر ذمہ داری خود اس کے نفس کی ہے، دوسروں کے لئے وہ ذمہ دار نہیں، اگر ساری دنیا گمراہ ہوجائے جب بھی تمہیں حق پر قائم رہنا چاہئے''۔ (ترجمان القرآن:۲/۶۷۸)

آیت کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی اصلاح کو مقدم کرے، یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسروں کی اصلاح کی فکر ہی نہ ہو، سیدنا صدیق اکبرؓ نے اسی کو واضح کیا ہے، فرمایا کہ لوگو! تم یہ آیت پڑھ کر یہ سمجھتے ہو کہ دوسروں کی فکر بالکل نہ کی جائے، بس اپنی ہی فکر ہو، یہ غلط مطلب ہے، میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب لوگوں کا یہ حال ہوجائے کہ وہ برائی دیکھ کر اسے مٹانے کی اور ظالم کو ظلم کرتا دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے روکنے کی کوشش نہ کریں تو بعید نہیں کہ اللہ انہیں اپنے عذاب کی لپیٹ میں لے لے۔

معلوم ہوا کہ آیت کا منشا یہ ہے کہ اپنی اصلاح کا عمل مقدم ہو، پھر دوسروں کی اصلاح کا کام شروع کیا جائے، یہ ترتیب ملحوظ رہے گی تو اس کی تاثیر نمایاں ہوکر رہے گی، انبیاء، صحابہ وسلف کی تاریخ میں یہ ترتیب نمایاں نظر آتی ہے، انہوں نے جس چیز کا بھی حکم دیا سب سے پہلے خود اس پر عمل کرکے دکھایا، دوسروں کی بقدر وسعت اصلاح مطالباتِ دین ہی کا حصہ ہے، آیت کا مقصود دوسروں کی اصلاح سے منع کرنا نہیں صرف اس کے مبالغہ آمیز تخیل میں اعتدال پیدا کرنا مقصود ہے۔

بقول مفسر دریابادیؒ:

''مطلب یہ نہیں کہ دوسروں کو اچھی بری بات بتاؤ نہیں، بلکہ یہ ہے کہ دوسروں کی عیب چینی اور کھوج میں نہ پڑے رہو، امر بالمعروف نہی عن المنکر تو بجائے خود ایک انفرادی

فریضہ ہے، اس کا سقوط مقصود نہیں، اسلام تو ایک اجتماعی دین ہے، جس میں فرد کے ساتھ ساتھ جماعت وملت کی بھی اصلاح وفلاح مطلوب ہے، آیت کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ انسان جب یہ دیکھ لے کہ وعظ وپند مطلق کارگر نہیں ہوتا، بلکہ الٹا اس پر اور مضحکہ ہوتا ہے تو ایسے موقعہ پر چاہئے کہ سکوت سے کام لے اور بس اپنے ہی ذاتی اعمال کی فکر میں لگا رہے، مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہی طریقہ ہے عارفین سالکین کا کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کر دینے کے بعد پھر کسی کے زیادہ درپے نہیں ہوتے''۔ (تفسیر ماجدی:۱/۹۸۰)

ٹی وی اور ڈش کے نقصانات

موجودہ حالات میں ٹی وی اور ڈش کے ذریعہ فحاشی اور عریانیت کا جو طوفان ہر جگہ پھیلا ہوا ہے اور اس کے مسموم اثرات سے ہر چھوٹا بڑا جس طرح متأثر ہے، اس کی زہرناکی سے واقفیت اور اس سے حفاظت پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہوگئی ہے۔

فقہی تفصیلات سے قطع نظر اگر اخلاقی نقطۂ نظر سے ڈش اور ٹی وی کے نقصانات کا تجزیہ کیا جائے تو ہر صاحب عقل یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ جنسی رجحانات کو مشتعل کرنے، اخلاق کو فاسد کرنے، حیا وغیرت کا خاتمہ کرنے، رذائل وفواحش کی ذہن سازی کرنے، اور نئی نسل کو مقصدیت اور تعمیر سے بے کاری اور تخریب کی راہ پر لے جانے کا سب سے اہم باعث ٹی وی اور ڈش کا طوفان ہے۔

سب سے بڑا نقصان ٹی وی اور ڈش کا یہ ہے کہ وہ مردوں کی غیرت کو ختم کردیتا ہے، غیرت وہ امتیازی وصف محمود ہے جو اللہ ایک بندۂ مؤمن میں راسخ دیکھنا چاہتا ہے، ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ انسان کی غیرت ختم ہوجاتی ہے اور اس کی جگہ دیوثیت آجاتی ہے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بے غیرت ودیوث آدمی جنت میں داخل نہ ہوگا، جنت اس کے لئے حرام ہے، ٹی وی اور ڈش کے فحش وعریاں پروگراموں، تصاویر ومناظر کو دیکھ کر غیرت وحمیت کا دامن تارتار ہوجاتا ہے۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ خاص طور پر عورتوں کے اندر سے حیا ختم ہوجاتی ہے، ٹی وی وغیرہ کے ذریعہ حیا وشرم ختم ہوکر اس کی جگہ بے حیائی وبے شرمی آجاتی ہے، اور حدیث سے

معلوم ہوتا ہے کہ جب حیا ختم ہو جاتی ہے تو پھر آدمی سب کچھ کر سکتا ہے، اسلام میں حیاء کا بہت اونچا مقام ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

''حیاء ایمان کا عظیم شعبہ ہے اور اعلیٰ اخلاق میں سے ہے''۔ (ابن ماجہ)

یہ بات بالکل مشاہد ہے کہ ڈش وٹی کے ذریعہ حیاء ختم ہو جاتی ہے جس کے برے اثرات یہ ظاہر ہوتے ہیں کہ عورتوں میں بے حجابی آجاتی ہے، پردہ بوجھ سمجھا جانے لگتا ہے، دوسرے ساتر لباسوں کا اہتمام باقی نہیں رہ جاتا، ٹی وی اور فلموں کے عریاں مناظر اور باریک لباسوں کی تقلید کا خیال جاگزیں ہو جاتا ہے، احادیث میں ان عورتوں کو مستحق لعنت اور جہنمی بتایا گیا ہے جو لباس ایسا پہنتی ہیں جن سے جسم جھلکتا ہے اور نظر آتا ہے، اور اعضاء ظاہر ہوتے ہیں۔

بے حیائی کے نتیجہ میں خیر وشر اور نیک وبد کی تمیز اٹھ جاتی ہے، اجنبی مردوں سے اختلاط معیوب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے مہذب اور شائستہ عمل باور کیا جاتا ہے، اجنبی مردوں سے گفتگو کرتے وقت نزاکت اور نرمی ظاہر کی جاتی ہے، قرآنی احکام کی صریح خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں صراحۃً ازواجِ مطہرات کو بلا واسطہ اور تمام عورتوں کو بالواسطہ حکم ہے کہ:

يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ! لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ، إِنِ اتَّقَيْتُنَّ، فَلاَ تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِىْ فِىْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفاً.

(الاحزاب/ ۳۲)

ترجمہ: اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو، اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔

یعنی لہجے میں کوئی لوچ نہ ہو، باتوں میں کوئی لگاوٹ نہ ہو، ایسا انداز نہ ہو جو مرد کے جذبات کو برانگیختہ کردے، مگر ٹی وی کے طوفانِ فحاشی نے اب عورتوں کو اس حکم قرآنی کی مخالفت کا عادی بنا دیا ہے، ڈش کے پروگرام دیکھنے اور سننے کی عادی خواتین میں اجنبی مردوں سے گھلنا ملنا، شور مچانا، ہنسی مذاق کچھ بھی معیوب نہیں رہتا۔

مزاج وطبع میں بے حیائی جب آجاتی ہے تو زبان سے بے حیائی کی باتیں بھی نکلتی ہیں، یہ ٹی وی اور ڈش کے نمایاں نقصانات میں سے ہے۔

تیسرا نقصان یہ ہے کہ جنسی وصنفی رجحانات میں ٹی وی وڈش سے اشتعال پیدا ہوتا ہے، زنا اور فواحش کی قباحت دلوں سے نکل جاتی ہے، احادیث میں آیا ہے کہ نگاہ کا زنا دیکھنا ہے، یہ زنا تو ٹی وی اور ڈش کے ہر پروگرام کو دیکھنے والے سے سرزد ہوتا ہے، یہ زنا کا پہلا مرحلہ ہے جو آگے بڑھ کر زنا کے دوسرے مراحل تک متعدی ہوتا ہے۔

ماہرین کا یہ تجزیہ ہے کہ فلمیں جنسی رغبت میں اشتعال انگیزی کرتی ہیں اور معصوم ونوخیز بچوں اور بچیوں کے ذہنوں کو آلودہ اور مسموم کرتی ہیں، اور اس کے نتیجے میں بے شمار زنا کے واقعات پیش آتے ہیں۔

اس لحاظ سے ٹی وی، ڈش وغیرہ کا استعمال دینی واخلاقی نقطۂ نظر سے بہت مہلک اور ضرر رساں ہے، محض خبروں اور حالات کی آگاہی کے لئے ٹی وی وغیرہ کا استعمال بھی خطرناک ہے؛ کیونکہ اس کے ذریعہ بھی ان خطرناکیوں سے بچاؤ مشکل ہے جو ٹی، وی کے ذریعے آتی ہیں، اس لئے انسانیت کا مفاد اسی میں ہے کہ ایسے آلات سے مکمل اجتناب کیا جائے، اور اپنی نئی نسل کو تخریب وبگاڑ کے بجائے تعمیر ومقصدیت کی راہ پر لگایا جائے۔

مَیں کے بجائے ''ہَم'' مطلوب ہے

عربی زبان کا لفظ ''انا'' (جو ''میں'' کے معنیٰ میں آتا ہے) بہت ہی معروف وکثیر الاستعمال لفظ ہے جو واحد متکلم کے لئے بولا جاتا ہے، اوراسی سے انانیت کی اصطلاح بھی ماخوذ ومشتق ہے جوخود پسندی اور ذاتی مصلحت ومنفعت پرستی اور مادّہ پرستی وغیرہ معانی کے لئے استعمال ہوتی ہے،اس کے بالمقابل دوسرا لفظ ''نحن'' (جو ''ہم'' کے معنیٰ میں آتا ہے) جوجمع متکلم کے لئے ہے،اورانانیت کے مقابلہ میں ''نَحنیت'' کی اصطلاح اس سے اخذ کی جاسکتی ہے جس کا اطلاق اجتماعیت،تعاونِ ملی،قومی منفعت کی ترجیح وغیرہ معانی پر ہوسکے۔

پسماندہ، اخلاق سے منحرف اور مائل بہ زوال اقوام پر انانیت کا احساس غالب رہتا ہے جب کہ ترقی یافتہ، بااخلاق، زندہ وسرگرم اقوام پر اجتماعی وقومی شعوراورقومی ترقی وبلندی کی فکر کا رجحان غالب رہتا ہے، جس طرح ہر انسان انانیت اوراجتماعیت دونوں طرح کے احساسات کا حامل رہتا ہے لیکن کچھ افراد پر انانیت کا احساس اس طرح سے غالب رہتا ہے کہ ان کی ہر نقل وحرکت اورقول وعمل کا اصل محور ومرکز اور دار ومدار خود پسندی وانانیت پر رہتا ہے، اور دیگر کچھ افراد پر اجتماعی وقومی احساس کا غلبہ رہتا ہے، اور وہ ہمیشہ قومی مفاد، عوامی فلاح وصلاح ہی کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں، جب کہ کچھ افراد کا معاملہ درمیانی ہوتا ہے، ان کی عملی سرگرمیوں میں انانیت اوراجتماعیت دونوں عناصر یکساں طور پر ملتے ہیں، یہی حال اقوام وامم کا بھی ہوتا ہے، کسی قوم پر انانیت، اورکسی پر اجتماعیت غالب رہتی ہے جب کہ کچھ قومیں درمیانی معاملہ رکھتی ہیں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کچھ جگہوں پر ذاتی وانفرادی ملکیت کا خوب احترام ولحاظ ملتا ہے مگر قومی وعوامی ملکیت کا برائے نام بھی احترام نہیں ملتا، سڑک اور روڈ پوری قوم کی ملکیت ہے، مگر بہت سے مقامات پر اسے ذاتی چیز سمجھ کر اس پر گندگیوں اور غلاظتوں کا انبار پھینک دیا جاتا ہے، یہ انانیت وخود پسندی کے غلبہ اور اجتماعی احساس کے فقدان کی ایک معمولی مثال ہے، جب کہ دوسرے مقامات پر ایسا نہیں ہوتا، بلکہ سڑکوں کو قومی چیز سمجھ کر اس کی صفائی کا اہتمام ہوتا ہے اور اسے گندگی سے دور رکھنے کی فکر ہوتی ہے۔

شیخ محمد عبدہ کا یہ واقعہ منقول ہے کہ ایک بار وہ سفر پر تھے، ان کے رفیق سفر نے راستہ کے کسی درخت سے گلاب کا پھول توڑ لیا، یہ منظر دیکھ کر شیخ رونے لگے، سبب دریافت کیا گیا تو بتایا کہ میں نے ایک انگریز عورت کو دیکھا کہ دورانِ سفر اس کا چھوٹا بچہ راستہ سے گلاب توڑنے چلا تو اس نے بچہ کو روکا اور سختی سے ڈانٹا اور یہ کہا کہ یہ پھول ہر مسافر کی ملکیت ہے، یہ تنہا تمہاری ملکیت نہیں ہے، اسے باقی رہنا چاہئے تا کہ آج کے اور کل کے اور اسکے بعد کے مسافر اس کی خوشبو اور رونق سے لطف اندوز ہوسکیں، شیخ نے کہا کہ افسوس اور رونا اس کا ہے کہ ہم پر انانیت کا غلبہ ہے اور ہم اجتماعیت اور مفادِ عام کے احساس سے ناآشنا ہیں۔

انانیت پسندوں کی طرف سے نیک کاموں میں، غریب محتاج کے تعاون میں بھی انانیت وخود پسندی کا مظاہرہ ہوتا ہے، ان کی جیب سے پیسہ جب ہی نکلتا ہے جب فقیر بالکل جم اور چمٹ جائے اور واپسی پر کسی صورت آمادہ ہی نہ ہو، اور پھر جب پیسہ نکل بھی جاتا ہے تو وہ اپنی انا کی تسکین اور ریاکاری کے مقصد سے سب کے سامنے برسر عام فقیر کے ہاتھ میں تکبر کے انداز میں دیتے ہیں، ان کی یہ ساری حرکتیں ان کی انانیت کا نتیجہ ہوتی ہیں، جب کہ اجتماعیت کا احساس رکھنے والے افراد بڑی تواضع وہمدردی کے ساتھ نوعِ انسانی کے ہر واقعی ضرورت مند کے لئے دل گیر ہوتے ہیں اور حسب المقدور تعاون کرتے کراتے ہیں

اور مستقل کوشاں رہتے ہیں اور سب کچھ اپنا حق لازم سمجھ کر انجام دیتے ہیں، دوسروں کے دکھ درد میں شریک رہتے ہیں۔

عالمی طور پر اقوام کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ انانیت پسند افراد بے پناہ ہیں، اور اجتماعی شعور کے حاملین خال خال ہیں، بگاڑ کا عام ہونا اور صلاح وفلاح کا کم یاب ہونا اس کا واضح ثبوت ہے، ظالموں کا معصوموں و بے قصوروں کو نشانہ بنانا اسی وجہ سے ہے، موجودہ عالمی منظر نامے میں امریکہ کا افغانستان کو تباہ کرنے کے بعد عراق پر حملہ آور ہونا اور پٹرول کی دولت پر مکمل تسلط کے ارادہ سے جنگ چھیڑنا اسی خود پسندی کی فکر کا واضح اور تازہ مظہر ہے، اور عرب وغیر عرب ممالک کی امریکہ کی خاموش تائید وحمایت اور عراق کی مدد وتعاون سے دریغ اور اس طرح حق کی مدد نہ کر کے باطل کی خاموش تائید اور اس کے سامنے سپر اندازی کا بھی اصل سبب اپنے اقتدار وذاتی مفادات کا تحفظ ہے جو خود پسندی کے سوا اور کچھ نہیں، فلسطین کے مظلوموں کے حق میں عملی اقدامات پر قدرت اور اتحادی گروہ کی تشکیل کے ذریعہ اسرائیلی جارحیت کے سدّ باب کی استطاعت کے باوجود عرب حکمرانوں کا پس وپیش اور اپنے اقتدار میں مست وغرق رہنا بھی اپنے مفادات کی حفاظت اور قربانیوں ومشکلات کا تحمل کرنے کے جذبہ سے محرومی کی بنیاد پر ہے جو ان کی انانیت کی کھلی دلیل ہے۔

یوں تو ہر فرد بشر کے مزاج میں اجتماعی احساس انفرادی شعور پر غالب رہنا چاہئے کہ یہی انسانیت کی حقیقی روح ہے، لیکن اہل اسلام جو ابدی وسرمدی دین کے حامل اور علم بردار ہیں، ان کا یہ دینی و مذہبی، اخلاقی و عقلی فرض ہے کہ وہ سب سے آگے بڑھ کر اجتماعی احساس کو بیدار وغالب کریں، ان کے دل کی ہر دھڑکن اور دماغ کی ہر فکر اور جسم واعضاء کی ہر نقل وحرکت اور ہر قول وعمل، بلکہ گفتار ورفتار سب اسی جذبہ سے سرشار ہو۔

ان کی روشن تاریخ کا ہر صفحہ اس جذبہ سے سرشار افراد کی عملی سرگرمیوں سے بھرا ہوا

ہے، پوری اسلامی تاریخ اجتماعی احساسات کے تحت اہل اسلام کی پیش کردہ قربانیوں سے منور ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حد سے زیادہ سادہ زندگی صرف اسی لئے گذاری کہ آرام وراحت پہلے ان کی سب رعایا کو میسر آجائے، واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار کھانا کھا رہے تھے، اسی دوران عتبہ بن ابی فرقد آئے، حضرت عمرؓ کے کہنے پر عتبہ کھانے میں شریک ہوئے، کھانا اتنا موٹا تھا کہ عتبہ سے نگلا نہیں جا رہا تھا، انہوں نے عرض کیا اے امیر المؤمنین! بہتر ہو کہ آپ چھنا ہوا آٹا استعمال کریں، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کیا سب مسلمانوں کو چھنا ہوا آٹا دستیاب ہے، عتبہ نے کہا نہیں سب کو تو میسر نہیں ہے، حضرت عمر نے فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمام لذتیں دنیا ہی میں حاصل کرلوں۔

یہ واقعہ ان کے ایثار، خوف آخرت، اجتماعیت کے احساس وشعور کا اور ذاتی مصلحت ومنفعت کے حصول سے یکسر دوری اور بیزاری کا ثبوت ہے، حضرت عثمانؓ نے قحط کے عالم میں دسیوں اونٹوں پر لدا ہوا غلہ جو بہت نفع کے ساتھ فروخت ہوسکتا تھا، مفت لوگوں میں تقسیم کردیا تھا، تمام صحابہ نے ہر موقعہ پر دوسروں کا تعاون کیا، دوسروں کے نفع کو مقدم رکھا، دوسروں کے بھلے کے لئے اپنا ذاتی نقصان گوارا کیا، اسی وصف امتیازی کا ذکر قرآن نے کیا کہ:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. (الحشر/۹)

ترجمہ: وہ دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں خواہ خود اپنی جگہ کتنے ہی محتاج کیوں نہ ہوں۔

یہ سب ان کے اجتماعی شعور کی دلیل ہے، صحابہ اور اسلافِ امت کے ایثار واجتماعیت کے شعور کے بے شمار نمونے تاریخ میں محفوظ اور لائق تقلید ہیں۔

اہل اسلام اور موجودہ حالات میں خاص طور پر اہل عرب اور ان میں بطور خاص عرب حکمرانوں کو یہ حقیقت ذہن نشین کرنی ہوگی کہ جب تک انانیت کی جگہ اجتماعی شعور بیدار نہیں

ہوگا، جب تک ایثار وقربانی کا جوہر نہیں پیدا ہوگا، اور جب تک ذاتی مادّی اور حقیر مقاصد ومصالح سے دست بردار ہوکر قومی وملی مصالح کو اولین اہمیت نہیں دی جائے گی یوں ہی تباہی آتی رہے گی، اغیار ظلم کرتے رہیں گے، پسپائی اور دباؤ میں رہنا پڑے گا، یہ واقعہ ہے کہ حق کے مقدر میں سربلندی اور غلبہ ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ حق پر ہونے کا دعویٰ کرنے والے مطلوبہ اوصاف کے حامل ہوں، اس وقت کامیابی کے لئے کلیدی اہمیت اس کی ہے کہ انانیت کی جگہ اجتماعیت وایثار پیدا ہو اور ''میں'' کے بجائے ''ہم'' کی فکر عام ہو۔

اتحاد اہم ترین ضرورت ہے

احادیثِ نبویہ کے ذخیرے میں امتِ محمدیہ کے باہمی اختلاف وانتشار کی پیشین گوئیاں جابجا نظر آتی ہیں، اس موضوع کی سب سے مشہور حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سرکار دوعالم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ تفرَّقَتْ عَلىٰ ثِنْتَيْنِ وَسَبْعِيْنَ مِلَّةً، وَتَفْتَرِقُ اُمَّتِيْ عَلىٰ ثَلاثٍ وَّسَبْعِيْنَ مِلَّةً، كُلُّهُمْ فِيْ النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَاحِدَةً. (ابوداؤد)

ترجمہ: یہود ونصاریٰ ۷۲/فرقوں میں بٹ گئے، میری امت ۷۳/فرقوں میں بٹ کر رہے گی۔ بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ ''سوائے ایک فرقے کے سب جہنم میں جائیں گے''۔

مسائل وعقائد اور دینی افکار کے اختلافات تو شروع سے چلے آرہے ہیں اور روز بروز بڑھ رہے ہیں، اس کے علاوہ ملی وملکی، قومی واجتماعی مسائل میں بھی امت کا مختلف ٹولیوں میں بکھراؤ اور ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونا اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مرض، ان کی واضح شناخت، اغیار کے لئے سنہری موقعہ اور مسلمانوں کے زوال وادبار کا اصل سبب ہے، قرآن کریم میں ایک طرف قرآن کو مضبوطی سے پکڑنے اور ہر شعبۂ زندگی میں اس پر عمل کرنے کا حکم ہے، دوسری طرف تفرقہ بازی سے بچنے کا حکم ہے، اس طرح یہ اشارہ کردیا گیا ہے کہ قرآن پر عمل کے نتیجہ میں اتحاد آتا ہے اور انتشار جاتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اختلاف سب سے مہلک مرض ہے، اسی لئے اسلام اپنے حاملین کو ہر

طرح سے اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے، اختلاف کی مذمتوں اور اتحاد کے فوائد کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہے، احادیث میں اختلاف کو سبب ہلاکت بتایا گیا ہے، سابقہ امتوں کی تباہی اور بربادی کا ایک اہم سبب اختلاف بھی تھا۔

تفرقہ واختلاف کا وجود لازمی ہے، اس کا ذکر حدیث میں ملتا ہے ''حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے تین دعائیں کیں، دو دعائیں قبول کرلی گئیں، ایک دعا قبول نہ ہوئی، میں نے اللہ سے یہ دعا کی کہ میری امت کو قحط عام میں ہلاک نہ کرے، دوسری دعا یہ کی کہ میری امت غرق آب ہوکر نہ ہلاک ہو، یہ دونوں دعائیں قبول ہوگئیں، تیسری دعا یہ کی کہ مسلمان باہم ایک دوسرے سے نہ لڑیں، اللہ نے یہ دعا قبول نہیں کی''۔ (مسلم شریف)

اسلاف امت اختلاف کو کتنا خطرناک سمجھتے اور دور بھاگتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے منیٰ میں چار رکعت نماز پڑھائی، قصر کی رخصت پر عمل نہ کیا تو اس پر صحابہ میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں، حضرت عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا کہ میں نے منیٰ میں دو رکعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بھی پڑھیں اور حضرت ابوبکر وعمر کے پیچھے بھی، اب حضرت عثمان دو کے بجائے چار پڑھا رہے ہیں، لیکن پھر ابن مسعود نے چار رکعت پڑھ لی اور فرمایا کہ اختلاف سے شر پیدا ہوگا، اس شر سے بچنے کے لئے دو کے بجائے چار رکعات پڑھ لی۔ (ابوداؤد شریف)

قرائن بتاتے ہیں کہ ابن مسعود کا نقطۂ نظر دو رکعت کے استحباب وافضلیت کا تھا مگر چار کے اتمام کو بھی وہ جائز سمجھتے تھے، اگر قصر واجب ہوتا تو وہ چار رکعت نہ پڑھتے، اس واقعہ سے یہ اصولی ضابطہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دفع مفاسد حصول مصالح پر مقدم ہے، حضرت ابن مسعود نے اختلاف کے مفسدہ کو دفع کرنے کے مقصد کو اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مصلحت کے حصول پر مقدم رکھا۔

اختلاف پیدا ہونے کے اسباب متعدد ہوتے ہیں، جن میں خواہش پرستی، جہالت،

بے خبری، دل کی کجی، دماغ کی عدم سلامتی، نااہلوں سے حصول علم اور ان کی ہم نشینی، ناسمجھی، تشددِ بیجا، اعتدال سے دوری، بدعت، تعصب، غیروں کے افکار سے بے انتہا مرعوبیت وتأثر، امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ سے سستی وغیرہ شامل ہیں۔

اختلاف کوختم کرنے اور اتحاد لانے کے بہت سے ذرائع واسباب ہیں، سب سے اصل ومقدم سبب کتاب وسنت کا زندگیوں میں عملی نفاذ اور مضبوطی سے تھام لینا ہے، سلف صالح کے طریقہ کی پیروی، تفقہ فی الدین بھی اہم اسباب ہیں، علمائے حق سے رابطہ اور تعلق ومجالست، خدمت وتعظیم بھی اتحاد کا باعث ہے، علماء کو حدیث میں خیر کی کنجی اور شر کا سدّ باب کرنے والا قرار دیا گیا ہے، فتنوں کے ہجوم میں علمائے حق کی قربانیاں اور ثابت قدمی ہی مقابلہ کرتی ہیں۔ فتنۂ ارتداد کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کی بے مثال ثابت قدمی اور فتنۂ خلق قرآن کے موقع پر حضرت امام احمد بن حنبلؒ کی استقامت نے دین حق کو غلبہ وسربلندی عطا کی تھی۔ ابنؒ قیم کہتے ہیں کہ فتنوں کے عالم میں جب ہم پر شدید خوف طاری ہوجاتا تھا اور زمین تنگ معلوم ہونے لگتی تھی تب ہم شیخ ابن تیمیہ کے پاس آتے تھے اور ان کو دیکھتے ہی اور ان کی بات سنتے ہی سارا خوف چلا جاتا تھا اور سارا غم ختم ہوجاتا تھا۔ (الوابل الصیب/ ۹۷)

جب تک ہر فرد پوری قوم کی اجتماعیت اور اپنی اور سب کی اصلاح کی فکر نہیں کرے گا، جب تک جزئی وفروعی امور میں سوقیانہ اور غیر مہذب اختلاف ختم نہیں کیا جائے گا اور جب تک ہر نوع کے تعصب کو ٹھکرایا اور فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ادا نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اتحاد ایک خواب رہے گا اور شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

اتحاد کا وجود دینی پختگی اور صلابت پر منحصر ہے، دینی صلابت کا فقدان موجودہ اختلاف کی بنیادی وجہ ہے، تحریکات، تنظیمات، مضامین ومواعظ کبھی اتحاد پیدا نہیں کرسکتے اگر عملی جذبہ افرادِ امت میں نہ پیدا ہوسکے۔

مغربی نظام معاشرت کی ابتری

موجودہ دور میں عزت وذلت، بلندی وپستی اورشرافت ورذالت کے تصورات اور معیار بالکل الٹ کررہ گئے ہیں، حقائق کو مسخ کرنے اورسچائی کومشتبہ کرنے کا جوکام عصرحاضر کے نام نہاد ترقی پسندوں کی وجہ سے ہوا ہے وہ تاریخ عالم کا ایسا تاریک ترین اورشرمناک باب ہے جس کے سامنے تمام سیاہیاں ماند پڑجاتی ہیں۔

اس کا ایک نمایاں مظہر یہ بھی ہے کہ بے شمار مشرقی مسلم خواتین کا اس وقت یہ تصوراور خیال ہے کہ مغرب میں خواتین کو معاشرے میں نمایاں ترین مقام حاصل ہے، آزادی کی دولتِ بے بہا میسر ہے، تمام حقوق ملے ہوئے ہیں، تمام شعبہ ہائے حیات میں ان کے کارنامے ہیں، ہرمرحلے پران کا اہم رول ہے، اورزندگی کی تمام نعمتوں اوررونقوں سے وہ مالا مال ہیں، مشرقی خواتین کا مغربی خواتین کے بارے میں یہ تصور دراصل مشاہدہ وتجربہ نہیں؛ بلکہ میڈیا کی فراہم کردہ اطلاعات، خبررسانیوں، منظرکشی اور پروگراموں پرمبنی ہے، میڈیا کے ذریعہ آزادیٔ نسواں کی پرفریب صدا عرصۂ دراز سے لگائی جاتی رہی ہے، اورآزادی کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے فوائد اورمغربی خواتین کی پرعیش زندگی کے نمونے مختلف شکلوں میں سنائے، دِکھائے اورپیش کئے جاتے ہیں، مختلف عالمی تنظیموں اورتحریکوں کی طرف سے مساواتِ مردوزن کی صدا بھی لگائی جاتی ہے۔

مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسلمان خواتین تہذیب مغرب کی تجلیات میں خیرہ ہوکر اسی کی پیروبن جائیں اوراسلامی اعلیٰ اقدار واخلاق سے دستکش ہوجائیں، اپنی مذہبی وتہذیبی ذمہ

داریوں سے غافل ہوجائیں، اپنے فطری کاموں اور فرائض کو چھوڑ کر یورپ کی بے حجابانہ اور عریاں آزادی کے حصول کے لئے پوری طرح سے سرگرم ہوجائیں، اس طرح ان کی پاکیزگی داغدار ہوجائے، ان کی عزت کی چادر تار تار ہوجائے، ان کی کرامت وشرافت گدلی ہوجائے، بے حجابی اور مختلط ماحول کے اثرات سے ان کے دیدوں کا پانی اتر جائے، وہ حیا چھوڑ کر بے حیائی کو اختیار کرلیں، اور خواہش پرست انسانوں کے دامِ فریب میں آجائیں اور انہیں کا نشانہ بن جائیں اور اس طرح اپنے دین و مذہب سے مکمل بے گانہ و بیزار ہوکر یورپین کلچر میں اس طرح ضم (Mix) ہوجائیں کہ اسلام کا کوئی اثر ان کے کردار، باطن، سیرت اور صورت وظاہر اور قول وعمل میں نظر ہی نہ آئے، اور پھر یہ سب کچھ وہ اس طرح کریں کہ وہ اپنے کو ذلت سے نکل کر عزت میں اور پستی ورذالت سے نکل کر بلندی وشرافت میں آنے والا باور کریں اور ان کے ذہنوں میں یہ راسخ ہوچکا ہو کہ اسلام میں عزت وشرافت نہیں، وہ دقیانوسی، رجعت پسند، شدت پسند اور آؤٹ آف ڈیٹ مذہب ہے جب کہ مغربی کلچر میں عزت وشرافت ہے، بلندی وکمال ہے اور وہ ہر لحاظ سے نئے دور سے ہم آہنگ ہے، فطری تقاضوں کے موافق ہے، اپ ٹو ڈیٹ ہے، اور اس میں تمام مشکلات کا حل اور تمام مسائل کا مداوا ہے، ظاہر ہے کہ جب تصورات اس رخ پر آجائیں کہ حقائق مسخ ہوجائیں اور معیارِ عزت وذلت معکوس ہوجائے تو پھر درستگی اور اصلاح کے چانسز بیحد کم ہوجاتے ہیں۔

مغربی میڈیا اپنے ان مقاصد میں کافی کامیاب بھی ہوا ہے، بے شمار مشرقی گھرانوں میں اس نے شب خون مارے ہیں، کج فکر اور بے حجابانہ آزادی کے طالب اور دین سے محروم افراد اس کا نشانہ بنے ہیں، مشرقی خواتین مغربی خواتین کے شانہ بہ شانہ ہر کام میں شریک ہوئیں، آزادی کی تلاش میں ان کا دامنِ عصمت تار تار ہوا، وہ نشہ آور اشیاء کی عادی ہوئیں، وہ اخلاق سے عاری ہوئیں، مادّی زیب وزینت اور چمک دمک نے ان کو اپنا اسیر بنایا، اس طرح وہ ذلت اور پستی کی آخری حدوں کو جاپہونچیں، اور پھر ان میں بہتوں کو اپنی نادانی کا

احساس بھی ہوااور پھر وہ راہِ راست پر آئیں۔

مشہوراسلامی مفکر واسکالر ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اپنی کتاب ''اَلْمَرْأَۃُ بَیْنَ الْفِقْهِ وَالْقَانُوْنِ'' میں اپنے الم ناک مشاہدات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں نے یورپ کا چار بار دورہ کیا ہے، اور ہر بار مجھے سب سے زیادہ دکھ اور رونا اس پر آیا کہ مغربی عورت بڑی حرماں نصیبی کی زندگی گذار رہی ہے، آزادی کے نام پر اسے رسوا کیا جا رہا ہے، وہ ہر ایک کے لئے نوالۂ تر بنی ہوئی ہے، مغربی مرد عورت کی کمزوری کی قیمت وصول کر رہا ہے، اسے ہر طرح ذلیل کر رہا ہے، اس کا استحصال ہو رہا ہے، مادّی منافع اور جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے عورتیں استعمال کی جا رہی ہیں، سینما، ٹی وی، کلرڈ میگزین اور نمائشوں اور ان میں مغربی خواتین کا رول دیکھ کر جو لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسے آزادی اور بلندی باور کرتے ہیں، درحقیقت وہ بہت کوتاہ بیں ہیں، اگر یورپ میں دس عورتیں اونچے مناصب پر فائز اور بلند مرتبہ ہیں تو دوسری طرف وہیں دسیوں ملین عورتیں غلاموں جیسی پابند اور ذلیلانہ شرمناک زندگی گذارنے پر مجبور ہیں''۔

وہاں کے معاشی تنگ حالات نے عورتوں کو مختلف شعبوں میں مختلف سطحوں پر ملازمت اور کام کرنے پر بھی مجبور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سباعی لکھتے ہیں:

''لڑکی جب سترہ سال کی ہو جاتی ہے تو عموماً اس کے باپ اور اہل خانہ اس کے مصارف برداشت کرنے کے پابند نہیں ہوتے؛ بلکہ اسے خود اپنے لئے کام ڈھونڈنا پڑتا ہے، شادی کے بعد اسے اپنے گھر اور بچوں کی کفالت کے لئے شوہر کی طرح ملازمت کرنی پڑتی ہے، بڑھاپے میں ناتوانی کے باوجود اسے اپنے گذارہ کے لئے کام کرنا پڑتا ہے، اس کے بیٹے خواہ کتنے ہی مالدار اور صاحب ثروت کیوں نہ ہوں اس کا خرچ بالکل نہیں سنبھالتے''۔

اس ابتر صورتحال کے اصل سبب کا ذکر کرتے ہوئے شیخ سباعی نے لکھا ہے کہ:

''اس مادّی فلسفہ کا سب سے اہم سبب اور اثر یہ ہے کہ وہاں عورتوں کے تئیں انسانیت، اکرام، محبت اور مودّت کا کوئی تصور ہی نہیں ہے، وہاں عورتوں کو صرف تکمیل شہوات کا ذریعہ باور کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ اولاد کی صحیح تربیت ہے، اور نہ اولاد

کے نزدیک والدین کا احترام، بلکہ پورا خاندانی نظام مفلوج و منتشر ہے، صورتحال ہر لحاظ سے قابلِ تشویش ہے''۔

امریکہ کے بعض اداروں نے یہ سروے بھی کرایا ہے کہ کتنی خواتین ملازمت کرنا چاہتی ہیں، اور کتنی خواتین ملازمت چھوڑ کر اپنی خانگی و داخلی ذمہ داریاں نبھانا چاہتی ہیں؟ محتاط اندازہ کے مطابق امریکہ کی ۶۵ ر فیصد خواتین ملازمت سے تنگ ہیں، وہ مجبوراً ملازمت کررہی ہیں اور ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ وہ ملازمت کی ذلت سے خلاصی حاصل کرکے خانگی کام سنبھالیں۔

اس صورتِ حال کے پس منظر میں مشرقی مسلم خواتین کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اسلامی تہذیب کو اپنی آخری پناہ گاہ سمجھیں اور یہ یقین کرلیں کہ اس کے مقابلہ میں کوئی تہذیب انہیں وہ بلندی، رفعت، حیا، پاکدامنی، عزت، کرامت و شرافت، تقدس اور اخلاقی قوت نہیں دے سکتی جو اسلام نے ان کو عطا کی ہے۔

دعوتی کام کرنے والوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی ان مقدس تعلیمات سے خواتین کو روشناس کرائیں جن میں خواتین کے حقوق کا ذکر ہے، اور مغربی تہذیب کے نقصانات سے بھی آگاہ کرائیں۔

اسلام کا خاندانی نظام معاشرت اگر پوری طرح سے اپنالیا جائے تو تمام مسائل حل ہوسکتے ہیں، اسلامی نظام معاشرت اور مغربی نظام معاشرت کا سب سے واضح فرق یہی ہے کہ مغرب میں خاندانی نظام ٹوٹ رہا ہے، منتشر ہورہا ہے، میاں بیوی میں اعتماد و محبت کا فقدان ہے، مغربی مفکرین و فلاسفہ مضطرب ہیں کہ مغربی معاشرتی نظام کس تدبیر سے بکھرنے اور ٹوٹنے سے بچ سکتا ہے۔

جب کہ اسلامی نظام معاشرت اتحاد، اعتماد، محبت اور خوفِ خدا کی ناقابلِ شکست بنیادوں پر استوار ہے جسے کبھی توڑا اور بکھیرا نہیں جاسکتا، خواتین اسلامی سوسائٹی کی عظیم رکن اور مؤثر

وفعال عضو ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ مغربی تہذیب کا سایہ بھی اپنے اوپر نہ پڑنے دیں، خواتین فضائل بشری میں مردوں سے پیچھے نہیں ہیں، دینی معاملات میں وہ مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں، ہر جگہ ان کی خدمات ہیں، علم وادب، حدیث وتفسیر، جہاد واستقامت ہر میدان میں ان کے قابل رشک کارنامے ہیں، اللہ کی رحمت وبخشش میں بھی کامل مساوات ہے، وہاں مرد وزن میں تفاوت نہیں ہے۔

اس وقت ضرورت اسلامی نظام معاشرت کو عام کرنے اور مغربی نظام کا بائیکاٹ کرنے کی ہے، مغربی نظام زندگی کی حقیقی لذت وسرور وسکون سے خالی اور محروم ہے، وہاں تیز رفتار ترقیات ضرور ہوئی ہیں، محیر العقول سائنسی کارنامے ضرور ہیں مگر اپنی زندگی اور خاندان میں کوئی اصلاح اور سدھار ان سے نہ ہوسکا بقول اقبال: ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

مغرب کا دلفریب نعرہ:

آزادی اور جدت

کسی بھی معاشرہ کے بگاڑ اور زوال کی علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی قدروں، اصول اور طریقۂ کار کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی دریوزہ گری کرے، اور اپنی سماجی و مذہبی خصوصیات و امتیازات سے دستکش ہو کر دوسرے سماجوں اور تہذیبوں کی چاکری کرے۔

ازدواجی زندگی کا جو تصور اسلام نے دیا ہے وہ مغرب کے وضع کردہ قوانین سے یکسر مختلف ہے، مغربی اصول میں جنسی، نسلی اور قومی فرق اور بھید بھاؤ کو بنیادی درجہ دیا گیا ہے، وہاں کالے گورے کا فرق ہے اور گوروں کو کالوں سے بلند مرتبہ قرار دیا جاتا ہے وہاں مرد و زن کی مساوات کا جو نعرہ لگایا جاتا ہے اس میں حقوقِ نسواں کا اعلان بھی بڑے شد و مد سے کیا جاتا ہے، اہل مغرب زندگی کے ہر شعبہ میں عورت کو مرد کی صف میں مساویانہ کھڑا کرتے ہیں اور اسے اپنا تہذیبی امتیاز قرار دیتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ صدیوں کی غلامی کے بعد انہوں نے عورتوں کو آزادی دلا دی ہے، اور اب عورتوں کے آلام و مصائب کا دور ختم ہو چکا ہے۔

ان دلفریب نعروں کا عورتوں نے استقبال کیا اور متأثر ہو کر اپنا وقار اور حیا تار تار کر کے میدان میں آگئیں اور اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار باور کیا، لیکن اگر بغور جائزہ لیا جائے تو آزادئ نسواں کے نام پر کئے جانے والے پروپیگنڈہ کا فراڈ کھل کر سامنے آتا ہے کہ ان مغربی ممالک میں تمام تر گھٹیا اور نچلے کام عورت کے سپرد ہیں اور بلند عہدوں تک

رسائی ان میں سے ایک فیصد کی بھی نہیں ہے۔

تہذیب حاضر کی ہر کل ٹیڑھی ہے، عورت اپنے اہل خانہ کی خدمت کرلے تو یہ دقیانوسیت اور رجعت پسندی قرار پائے مگر وہی عورت اگر برسر عام ہوٹلوں میں، ہوائی جہازوں میں، پبلک دکانوں میں ویٹر، روم اٹنڈنٹ، ایئر ہوسٹس اور سیلز گرل بن کر خدمت کرے اور لوگوں کی ہوسناک نگاہوں کا ہدف بنے تو یہ آزادی ہے، جدت و اعزاز ہے۔

ماں ساٹھ سال سے زیادہ عمر کو پہنچ جائے تو اسے معذورین کے لئے موجود خاص مکان میں منتقل کردیا جاتا ہے، نرسیں اس کی دیکھ بھال کرتی ہیں، نتیجۃً ماں محبت، خلوص اور بے غرض خدمت سے محروم ہوجاتی ہے، وہ کس مپرسی اور بے چارگی کا شکار ہوکر موت کی منتظر رہتی ہے، کسی بیماری کا شکار ہوجانے پر اسے ہاسپٹل میں ہی شفٹ کردیا جاتا ہے اور ہاسپٹل کا عملہ دیکھ ریکھ کرتا ہے، اولاد کی ذمہ داری صرف مصارف ادا کرنے کی ہی رہ جاتی ہے، غرض یہ کہ مغربی نظام نے آزادی، جدت اور مساوات کے نام پر پورا فیملی سسٹم تباہ کردیا ہے، اسلامی خاندانی امتیازات کی خالصیت پر تیشے چلانے کی کوشش کی ہے۔

اسی مغربی نظام اور پروپیگنڈہ کی کشش ہے کہ زنا عام ہو رہا ہے، زن و شو کے تعلقات بگڑ رہے ہیں، خواتین ماں بننے سے گریزاں ہیں اور پورا معاشرہ بے حیائی کی آخری حدیں چھو رہا ہے، تبادلۂ ازواج کی بدترین رسم بھی جاری ہے، غیر قانونی بچے بڑھتے جارہے ہیں، ناجائز رشتے بڑھتے جارہے ہیں، خواہش نفس کی ہر طرح تکمیل کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے، طرفہ تماشا یہ ہے کہ مغرب زدہ افراد اپنے نظام کی تمام تر خرابیوں اور مفاسد کا اندازہ کرنے کے باوجود بھی اسلام مخالف حرکتوں سے باز نہیں آرہے ہیں اور جگہ جگہ یہ پروپیگنڈہ کررہے ہیں کہ اسلام نے عورتوں کو قید کردیا ہے، اسلام میں خواتین کا کوئی احترام نہیں، مساوات نہیں، وہاں عورتوں کو سیکنڈ پوزیشن دی گئی ہے اور بہت بڑا ظلم کیا گیا ہے۔

جب کہ اسلام نے تمام شعبہائے زندگی میں جو جامع، متوازن اور معتدل اصول تیار کئے ہیں ان کی تقلید ہی ہر مرض کا علاج اور ہر نقصان کی تلافی اور ہر بگاڑ کی اصلاح کا کام کرسکتی ہے، اسلام نے عورت کو جو عزت اور مرتبت عطا کی ہے وہ بے نظیر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِأَھْلِہٖ وَأَنَا خَیْرُکُمْ لِأَھْلِیْ.

ترجمہ: تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے لئے بہتر ہو، اور میں تم میں اپنے اہل وعیال کے حق میں سب سے بہتر ہوں۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ خواتین کی عزت شریف ہی کرتا ہے اور بے عزتی رذیل ہی شخص کرتا ہے۔

اسلام میں نکاح وشادی ایک پاکیزہ بندھن ہے، جس میں محبت، ہمدردی، پاکدامنی، پاکیزگی، صالح معاشرہ کی تشکیل، معتدل ترین خاندان کی تعمیر، اسلامی خطوط پر تعلیم وتربیت، اور حقوق شناسی اور حقوق کی ادائیگی وغیرہ تمام امتیازات ہیں۔

جب کہ مغرب میں اس طرح کا کوئی تصور نہیں ہے، وہاں ناجائز رشتوں کی بھر مار ہے، اور ازدواجی زندگی حد سے زیادہ کمزور اور بے اثر ہے، بلکہ وہاں ایسے اخبارات، میگزین اور کمیٹیاں ہیں جو اخلاقی بگاڑ اور ازدواجی زندگی میں خیانت کی دعوت دیتے ہیں، وہ اس کی ترکیبیں اور طریقے بتاتے ہیں، وہ عریانیت اور برہنگی کو تہذیبی امتیاز قرار دیتے ہیں اور پردہ وحجاب کو دقیانوسیت کہتے ہیں۔

بعض اخبارات میں اس طرح کی سرخیاں بھی آتی ہیں کہ کیا آپ اپنی شریک حیات کو دھوکہ دینا اور اس کے ساتھ خیانت کرنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ اپنی بیوی کے سامنے کوئی بہانہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں .... سے مدد طلب کیجئے۔

اس کو کمائی کا ایک ذریعہ بھی بنالیا گیا ہے، اور خیانت کے طریقے سکھانے والوں نے لاکھوں ڈالر کما لئے ہیں۔

ابھی حال ہی میں سوڈان میں خرطوم کے گورنر ڈاکٹر مجذوب نے ایک قانون پاس کیا ہے جس میں ہوٹلوں وغیرہ میں عورتوں کو ملازمت سے روک دیا گیا ہے، اس قانون کو وہاں کے علماء اور ائمہ نے پوری طرح قبول کیا ہے اور اسے خوش آئند اقدام قرار دیا ہے، مگر اس پر مغربی میڈیا بڑے شدومد سے جھنجھلا رہا ہے اور اسے آزادئ نسواں پر حملہ قرار دے رہا ہے۔

مغرب کی ازدواجی زندگی میں صرف جنسی تسکین ہی مرکزی اہمیت رکھتی ہے، وہاں آزادانہ اختلاط ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے، اور اسی آزادی کی دعوت اہل مغرب ہر طرح کے وسائل استعمال کر کے دے رہے ہیں، میڈیا کا تمام تر زور اسی پر ہے، اور وہ فحاشی، آوارگی، عریانیت کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔

باعث افسوس بات یہ ہے کہ یہ دعوت قبول عام حاصل کر رہی ہے، اور اسلامی ممالک میں بھی اس وباء کی شدت کچھ کم نہیں ہے، فرزندانِ توحید جو ایسے نظام کے حامل ہیں جو سراپا خیر واعتدال ہی ہے اور تمام مسائل کا حل ہے ان کا اپنے تہذیبی ومعاشرتی اقدار سے غافل ہو کر مغربی نظام کے پیچھے دوڑنا ایک عجیب وغریب سانحہ ہے، اور اسی میں ان کے زوال اور ضعف کا راز بھی مضمر ہے۔

افراط اور غلو کی لعنت

انسان کا معاملہ بڑا عجیب وغریب ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ زندگی محدود ہے، دنیا کا قیام بیحد مختصر ہے، اور اس دنیا سے جانا ضرور ہے، مگر پھر بھی اس کی امیدیں لامحدود ہیں، اس کی تمنائیں اور آرزوئیں لامتناہی ہیں، وہ خواہشوں اور توقعات میں اس طرح پور پور ڈوبا ہوا ہے جیسے کہ دوام وبقاء اس کا مقدر ہو اور اسے اِس دنیا میں ابد تک رہنا ہو۔

وہ کسی چیز کو چاہتا ہے اور محبت کرتا ہے تو انتہا تک پہونچتا ہے اور اس قدر افراط میں مبتلا ہو جاتا ہے جیسے اس کی محبوب شئ اور محبوب شخص میں خوبی ہی خوبی ہے، چاشنی ہی چاشنی ہے، کوئی خامی اور ترشی نہیں، اور جس سے نفرت کرتا ہے تو بھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے اور نفرت میں اتنا غلو کرتا ہے جیسے کہ اس قابل نفرت شئ اور شخص میں خامی ہی خامی ہے، کوئی خوبی نہیں، اپنی رائے کی تائید اتنی قوت سے کرتا ہے جیسے وہی حق ہے اور اس کے سوا سب غلط ہے، کسی رائے کی تردید کرتا ہے تو انداز یہ ہوتا ہے کہ وہ سراسر باطل ہے، حق ہونے کا ادنیٰ احتمال بھی اس میں نہیں پایا جاتا۔

یہی وہ غلو اور افراط ہے جو حقائق کو مسخ کرتا ہے، سچائی کو بدل دیتا ہے، درستگی کو پلٹ دیتا ہے، مشکلات میں مبتلا کر دیتا ہے تعلقات کو منقطع کر دیتا ہے اور بغض وعداوت کی تخم ریزی کرتا ہے۔

ہماری سیاسی، علمی، ادبی ہر تاریخ افراط کے ان مظاہر سے پر ہے، محبت وعداوت میں اس افراط نے انتہائی دوررس، مؤثر عداوتوں اور تنازعوں کو جنم دیا ہے، اور اس کے نتیجہ میں حق

وصواب کومسخ کیا گیا، خیر کومٹایا گیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کی قوت وشوکت کو ہلایا اور ختم کیا گیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مابین، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ کے مابین، حضرت علیؓ اور حضرت طلحہؓ کے مابین رونما ہونے والے اختلافات اجتہادی بنیادوں پر ہوئے، یہ ممکن تھا کہ انہیں رائے اور فکر کا اختلاف قرار دیا جاتا مگر حضرت علیؓ کی محبت اور نفرت میں افراط اور غلو نے مسلمانوں میں باہم برسر پیکار مختلف فرقوں کو جنم دیا، شیعہ، خوارج وروافض، حامیانِ علیؓ اور مخالفین علیؓ کے مختلف طبقات پیدا ہوئے، اور آج تک ہیں، اور ان کی لڑائیاں، خونریزیاں تب سے اب تک جاری ہیں، اور اس کے لئے کتنا خون بہایا گیا، کتنا ظلم ہوا، شریعت کی کس قدر بے حرمتی ہوئی، اس کا اندازہ مشکل ہے، بنی امیہ اور ان کے مخالفین کے درمیان جو اختلاف تھا وہ بھی مثبت تنقید کے دائرہ میں باقی رہ سکتا تھا مگر اس میں بھی یہی محبت ونفرت کا افراط لڑائیوں، قتل وظلم اور نہ جانے کتنی تباہیوں اور پستیوں کا باعث بنا۔

سیاسی میدان کے علاوہ علمی میدان میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اسی افراط کی وجہ سے کتاب وسنت، فقہ وادب، لغت ونحو کے متعدد بڑے علماء اور ائمہ کے سلسلہ میں بے اعتدالیاں سامنے آئیں، ان کی شہرت کو داغدار کیا گیا اور ان کے وقار کو مجروح کیا گیا، حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی شخصیت کو محبت ونفرت کے افراط کے نتیجہ میں شروع سے داغدار کرنے کی کوشش ہورہی ہے اور آج تک جاری ہے، ان کے مادحین ومحبین کا غالی طبقہ ان کی منقبت میں جھوٹی موضوع احادیث پیش کر کے ان کو بدنام کرتا ہے، دوسری طرف ان کے دشمنوں اور مخالفین کا غالی گروہ ان کو جاہل اور کتاب وسنت سے بے خبر ثابت کر کے ان کو داغدار کرنا چاہتا ہے۔

ائمہ فقہاء اور محدثین کے باہمی اختلافات کو اسی افراط کے نتیجہ میں حق وباطل کے معرکوں کی شکل میں پیش کیا جاتا رہا ہے اور مناظروں کے سلسلوں نے اس کو مزید تقویت پہونچا کر امت کا نقصان ہی کیا ہے۔

کوفہ وبصرہ کے نحویوں کا ختلاف، سیبویہ اور کسائی، متنبّی اور جریر وفرزدق کے غالی ناقدین ومادحین کو اسی افراطِ عقیدت ونفرت نے لایعنی اور مضر سرگرمیوں میں مشغول رکھا، امام ابن تیمیہ بھی وہ شخصیت ہیں جن پر اسی غلو اور افراط کی وجہ سے ظلم ہوا، ان کے غالی مادحین نے ان کو سب سے اونچا مقام دیا اور ان کی شخصیت مجروح کی، جب کہ ان کے غالی ناقدین نے ان کو کفر وزندقہ کے الزام میں پھنسا کر اسیر زنداں ہونے پر مجبور کیا۔

آج پوری دنیا میں سیاسی سطح پر خصوصاً یہ افراط ہر جگہ نظر آتا ہے، ایک لیڈر کے غالی معتقدین اسے سب سے بڑا انجات دہندہ اور واحد مستحقِ قیادت باور کراتے ہیں اور دوسرے لیڈر کے سلسلہ میں نفرت وعداوت کا خوب اظہار کرتے ہیں، جب کہ اس کے غالی مخالفین اسے سب سے بڑا مجرم، نااہل اور خائن ثابت کرتے ہیں، یہی حال مختلف الفکر مشائخ وعلماء کے مریدین وتلامذہ کا بھی ہے، یہی حال اخبارات اور ذرائع ابلاغ کا بھی ہے، آج اکثر ذرائع ابلاغ اسلام دشمنی کا جوثبوت دے رہے ہیں، وہ اسلام کے تئیں ان کی نفرت کے افراط اور غلو کا واضح ثبوت ہے۔

سیاسی، علمی، فکری اور ادبی ہر سطح پر ہمارے اسی غلو وافراط اور اعتدال سے دوری نے حقائق کو کس قدر مسخ کیا ہے، کتنا ظلم کیا ہے، کتنوں کا حق مارا ہے، کتنا نقصان پہونچایا ہے، دشمنوں کو کتنی کامیابیوں سے نوازا ہے اس کا اندازہ بہت مشکل ہے۔

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اعتدال ہر بھلائی کی جڑ اور بنیاد ہے، اور یہی اسلام کا امتیاز ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں افراط وتفریط سے کنارہ کشی اور اعتدال ومیانہ روی کی تعلیم وتلقین کرتا ہے، اسلام میں ایک طرف پیغمبر کی ذات کے سلسلہ میں افراط وغلو سے منع کیا گیا اور یہ تلقین کی گئی کہ نبی کو خدا کا بندہ ورسول سمجھا جائے، افراط وغلو کر کے اس میں الوہیت کی صفات نہ ثابت کی جائیں، اور دوسری طرف اسے خدا کے بعد سب سے افضل سمجھا جائے۔

دوسری طرف عبادت میں اتنا غلو نہ کیا جائے کہ نفس وجسم اور اہل وعیال کے حقوق میں کوتاہی ہو، روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما دن میں روزہ رکھتے اور رات بھر عبادت کرتے تھے، اہل وعیال کے حقوق سے غافل تھے، ان کی اہلیہ کی شکایت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ:

ایسا نہ کرو، روزہ رکھو اور افطار بھی کرو، عبادت بھی کرو اور آرام بھی کرو، تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تمہارے جسم کا تم پر حق ہے، تمہارے اہل وعیال کا تم پر حق ہے۔ (بخاری ومسلم)

اس طرح کے واقعات مختلف صحابہ کے ہیں، ہر موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتدال، اور اللہ کے حق کے ساتھ نفس واہل کے حقوق بھی ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

خرچ اور مصارف میں بھی اعتدال کا حکم ہے، ایک طرف اسراف اور فضول خرچی سے روکا گیا ہے اور دوسری طرف بخل اور ہاتھ روکے رکھنے سے منع کیا گیا ہے، اسی طرح عدل وانصاف کا حکم دیا گیا ہے اور یہ تلقین کی گئی ہے کہ ظلم سے بچا جائے، دشمن پر بھی ظلم نہ ہونے پائے، اور دوست کو دوستی کی رعایت میں دوسرے کا حق نہ دیا جائے، اور خواہش نفس کی پیروی نہ کی جائے۔

مختلف احادیث میں تعصب بیجا سے منع کیا گیا ہے، ایک جگہ فرمایا گیا کہ:

تین چیزیں نجات دہندہ ہیں اور تین چیزیں تباہ کن ہیں، حالت غضب ورضا میں عدل وانصاف، خفیہ وعلانیہ ہر حالت میں خوفِ خدا، فقر وغنی ہر حالت میں میانہ روی نجات کا باعث ہیں، جب کہ خود پسندی، اتباعِ ہویٰ، بخل وحرص تباہ کن امور ہیں۔ (معجم اوسط: طبرانی)

قرآنِ کریم امتِ محمدیہ کو ''امتِ وسط'' اور ''خیرِ امت'' اسی لئے قرار دیتا ہے کہ اس

کی زندگی کا ہر شعبہ جو ہرِ اعتدال سے مزین اور آراستہ اور بے اعتدالی سے بالکل دور ہے۔

امت اس وقت مصائب ومحن کا سامنا کر رہی ہے، اسے خطرات اور سازشوں سے مقابلہ ہے، دشمن بے شمار اور بیدار ومستعد ہیں، ایسے ماحول میں یہ ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ اعتدال کو شیوہ وشعار بنایا جائے، دینی ودعوتی کارکنان کے اخلاص میں شک نہ کیا جائے، بدگمانی نہ رکھی جائے، وقت ضائع نہ کیا جائے، وقت کا ہر لمحہ قیمتی سمجھا جائے اور افراط وغلو کی ان لعنتوں سے کوسوں دور رہا جائے جو ہماری تباہی اور زوال کا باعث ثابت ہوں، سب سے محفوظ و بے خطر شاہراہ اعتدال کی ہے، یہ امت کا امتیازی شعار ہے، امت کی فلاح وکامرانی اور سعادت ونجات کا راز اسی کو اپنانے اور حرزِ جاں بنانے میں مضمر ہے۔

احساسِ برتری اور احساسِ کہتری

مخلوقاتِ خداوندی میں انسان وہ عجیب وغریب مخلوق ہے جو بیک وقت مختلف تضادات کا مجموعہ ہے، انسان کی زندگی کے کچھ گوشوں کو بغور دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان تمام مخلوقات سے زیادہ توانا اور طاقت وَر ہے، یہاں تک کہ وہ فضا میں اڑنے اور سمندر میں غوطہ زن ہونے پر قادر ہے، وہ مختصر ترین وقت میں طویل ترین مسافت طے کرسکتا ہے، وہ اپنی کدّ وکاوش اور حکمت وتدبیر سے خشک بے آب وگیاہ صحراؤں کو گھنے اور بارونق باغات میں تبدیل کرسکتا ہے، وہ تمام مخلوقات کو اپنا تابعِ فرمان بناسکتا ہے، لیکن اگر دوسرے پہلو سے انسان کا جائزہ لیا جائے تو وہ اس کائنات کی کمزور ترین مخلوق نظر آتا ہے، حتی کہ ایک ضدّی مکھی اور چیونٹی بھی اس کی ناک میں دَم کردیتی ہے، اسے بے چین وپریشان کرڈالتی ہے، ایک معمولی کانٹا چبھ جاتا ہے تو وہ بیمار وبے قرار ہوجاتا ہے، ایک برا اور موذی خیال ووسوسہ اُسے موت کے قریب پہونچادیتا ہے۔

یہ عجیب وغریب تضادات کا مجموعہ انسانی مخلوق ہے جسے اللہ نے اپنے وجود کی ایک ظاہری دلیل بھی قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

وَفِیْ الأَرْضِ آیَاتٌ لِلْمُوْقِنِیْنَ، وَفِیْٓ أَنْفُسِکُمْ أَفَلاَ تُبْصِرُوْنَ.

(الذاریات: ۲۰-۲۱)

ترجمہ: اور زمین میں بھی نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لئے اور خود تمہارے اندر بھی، کیا تم دیکھتے نہیں؟

انسان اپنی روحانی وجسمانی دونوں تخلیق کے اعتبار سے سب سے ممتاز ومنفرد اور نمایاں ہے، وہ عالم اصغر ہے، اس کے چھوٹے سے جسم میں پوری کائنات نہاں ہے بقول شاعر: ؎

وَ تَـزْعَـمُ أَنَّکَ جِـرْمٌ صَـغِیْـرٌ

وَفِیْکَ انْـطَـوىٰ الْعَالَمُ الْأَکْبَرُ

تم یہ سمجھتے ہو کہ تم چھوٹا سا جسم اور مختصر وجود رکھتے ہو جب کہ فی الواقع پوری دنیا تم میں چھپی ہوئی ہے، اسی لئے کہا گیا ہے:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ.

ترجمہ: جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا، خودی کی معرفت کا نتیجہ خدا کی معرفت ہے۔

انسان کچھ پہلوؤں کے لحاظ سے بیحد قوی ہے اور کچھ پہلوؤں کے اعتبار سے بیحد ناتواں، اس لئے صاحب عقل وہی ہے جو قوت وضعف کے پہلوؤں کو فراموش اور نظر انداز نہ کرے، وہ اپنی قوت، ذہانت اور معلومات پر اکڑ نہ دکھائے اور اپنی برتری کا مدّعی نہ ہو، اور اس کا احساسِ برتری کبر وغرور کی حد تک نہ پہنچے، اسی طرح وہ اپنی کمزوری، بے بسی اور ناتوانی کے پیش نظر اپنے کو حقیر نہ سمجھے اور اس کا احساسِ کمتری ناکامی کی حد تک اسے نہ پہنچائے۔

افراد واقوام کی یہ دو بیماریاں ہوتی ہیں کہ یا تو ان کا احساسِ برتری کبر وتفاخر تک پہونچ جاتا ہے، یا ان کا احساسِ کمتری حقارت وذلت سے جا ملتا ہے، کبر وغرور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے کو ذلیل وحقیر باور کرنے لگتا ہے، جن امور پر اسے قدرت نہیں ہوتی ان پر قدرت کے فضول دعوے کرنے لگتا ہے، اپنے دائرۂ کار واختیار سے خارج چیزوں میں دخل اندازی کر بیٹھتا ہے، جن چیزوں سے ناآشنا ہوتا ہے ان سے آشنائی اور آگاہی کا مدعی ہو جاتا ہے، پھر وہ کسی کے نصائح اور ہدایات پر کان نہیں دھرتا، کسی بڑے کو بڑا نہیں مانتا، اس کے

سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا، کسی عالم کا احترام نہیں کرتا، کسی صاحب فضل کے فضل کا اعتراف نہیں کرتا، وہ اپنے آپ کو سب سے بڑا عالم، سب سے بڑا عقل مند، سب سے باعظمت وعالی مرتبت، ادب واکرام کا اولین اور بجا طور پر مستحق سمجھنے لگتا ہے۔

تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ بیماری ان افراد میں زیادہ ہوتی ہے جو پستی سے یکا یک کچھ بلندی کی طرف، ناداری وفقر سے اچانک کچھ مالداری ودولت مندی کی طرف، پسماندگی سے یک بیک کچھ ترقی کی طرف آتے ہیں، جو پہلی بار دولت پالیتے ہیں یا اتفاقاً کوئی عہدہ ان کے ہاتھ آجاتا ہے ان کی حالت یہی ہوتی ہے کہ ان کا مزاج تکبر وتعلّی کی آخر حد تک پہونچ جاتا ہے بلکہ وہ دوسروں کو انسان بھی سمجھنا گوارا نہیں کرتے، اور ہر ایک کو جاہل واحمق قرار دینے لگتے ہیں۔

کسی قوم میں یہ بیماری جب جڑ پکڑ لیتی ہے تو وہ قوم بے راہ رَو ہوجاتی ہے، وہ خیر خواہوں کو بدخواہ سمجھنے لگتی ہے، قعرِ مذلت میں گرنے کے باوجود وہ اپنے کو علیین پر مقیم باور کرتی ہے، مصائب کے گھیرے میں ہونے کے باوجود وہ اپنے کو مکمل محفوظ قرار دیتی ہے، دشمنوں کے نرغے میں ہونے اور اپنے بے بس ومغلوب ہونے کے باوجود اپنے کو سب سے طاقت ور اور غالب اور دشمن کو سب سے کمزور سمجھتی ہے، نتیجتاً اس قوم پر ادبار مسلط ہوجاتا ہے اور وہ کارگاہِ حیات میں کوئی تعمیری انقلاب تو کجا اپنے وجود کی حفاظت تک سے قاصر رہ جاتی ہے۔

دوسری بیماری احساس کمتری ہے، جو انسان اپنی کمتری اور کہتری کا احساس کرلیتا ہے وہ شکستہ خاطر، مردہ دل، بے حوصلہ، منکسر الارادۃ، اور ناامیدی کا شکار ہوجاتا ہے، اور خود اعتمادی کے جوہر سے محروم ہوجاتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ زندگی میں کوئی کام اور اقدام اس کے بَس کا نہیں ہے، کسی قوم میں جب یہ مرض آتا ہے تو اس کی حیات وحرکت، سعی وعمل سب شل ہوجاتے ہیں، وہ ذلت کا نشانہ بنالی جاتی ہے، اور ہر لحاظ سے اسے کمزور کردیا جاتا ہے اور اسے لوٹ کھسوٹ لیا جاتا ہے۔

امتِ مسلمہ میں عمومی طور پر یہی مرض موجود ہے، اور اس کے نتائج کھلی آنکھوں سے

دیکھے جاسکتے ہیں، اورخاص طور پر بعض افرادِ امت میں کبر وغرور کی جو بیماری پائی جاتی ہے اس کا نتیجہ بھی عالم آشکارا ہے۔

جب کہ اسلامی تعلیمات میں احساس برتری کے افراط اوراحساسِ کمتری کی تفریط دونوں سے نکال کرخود اعتمادی اور جذبۂ عمل کے اعتدال کی ترغیب کے نمونے جا بجا دیکھے جاسکتے ہیں، ایک طرف اسلام کبر وغرور سے سختی سے منع کرتا ہے، اسے پستی وذلت کا سبب بتاتا ہے، اور یہ واضح کرتا ہے کہ ہر نعمت اللہ کی عطا کردہ ہے، ہر قوت اس کی بخشیدہ ہے، ہر صلاحیت اسی کی ودیعت کردہ ہے، سب سے بڑا وہی ہے، سب سے زیادہ علم اسی کو ہے، اس کے مقابلے میں انسان بیحد ناتواں، جاہل، عاجز وبےبس ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے:

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ. (النحل: ۵۳)

ترجمہ: جونعمت بھی تم کوملتی ہے وہ منجانب اللہ ہے۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ. (یوسف: ۷۶)

ترجمہ: ہر جاننے والے سے بڑا جاننے والا موجود ہے۔

وَمَآ أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلاً. (الاسراء: ۸۵)

ترجمہ: تمہیں تو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

اسی طرح اسلام غرور وکبر سے روکتا ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی اسی کی عملی تعلیم ہے، فتح مکہ کے موقعہ پر کافروں کی سابقہ لاتعداد اور سخت ترین اذیتوں کے باوجود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبر وغرور کا ادنیٰ سا مظاہرہ نہ خود فرمایا اور نہ صحابہ سے ہونے دیا بلکہ جانی دشمنوں کو یک لخت معاف کردیا اور اپنی تواضع اور حسن اخلاق سے دل فتح کرلئے، اور فرمایا:

اَنَا ابْنُ امْرَأَةٍ مِنْ قُرَيْشٍ كَانَتْ تَأْكُلُ الْقَدِيْدَ.

ترجمہ: میں ایک قریشی خاتون کا فرزند ہوں جو سوکھے گوشت کے ٹکڑے

پر گذارہ کرتی تھی۔

رسالت، نبوت، کمالِ علم وفضل، حکمت وفراست اور فتح وکامیابی سب سے بہرہ مند ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس متواضعانہ اور کبر وغرور سے کوسوں دور رویے میں قیامت تک لئے پوری انسانیت کے احساسِ برتری اور کبر وغرور سے اجتناب کی بے انتہا جامع اور مؤثر عملی تعلیم ہے۔

دوسری طرف اسلام احساسِ کمتری سے روکتا ہے، خود اعتمادی پیدا کرنے کا حکم دیتا ہے، قرآن اسی لئے امت محمد یہ کو امتِ وسط اور خیر امت کہتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ اگر تم مؤمن کامل ہو جاؤ تو سربلندی تمہیں ہی ملنی ہے، اسی طرف ارشاد نبوی ہے:

لَا یَحْقِرَنَّ أَحَدُکُمْ نَفْسَهٗ. (ابن ماجه)

ترجمہ: تم میں سے کوئی ہرگز اپنے کو حقیر نہ سمجھے۔

صحابہ کی تاریخ میں احساس کمتری کا کوئی تصور نہیں ملتا، کسی صحابی نے اپنے کو کمتر نہیں سمجھا، دشمنوں کی بے پناہ قوت وکثرت کے باوجود صحابہ کا اعتماد باقی رہا اور اسی لئے وہ فاتح وکامران رہے، مرعوبیت اور احساس کمتری زندہ قوموں کی علامت نہیں ہے، امت محمد یہ کے اکثر افراد جو آج مرعوبیت اور احساسِ کمتری کے شکار ہیں اگر اپنے دلوں میں خود اعتمادی پیدا کرلیں اور ایمان کامل کی دولت سے مالا مال ہو جائیں تو وہ ذلت ومسکنت کے شکنجہ سے باہر آسکتے ہیں، اور ان کے حق میں یہ وعدۂ الٰہی پورا ہوسکتا ہے:

وَنُرِیْدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِیْ الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِیْنَ. (القصص: ۵)

ترجمہ: ہم چاہتے ہیں کہ ان لوگوں پر مہربانی کریں جو زمین میں ذلیل وکمزور کر کے رکھے گئے ہیں اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہیں کو وارث بنائیں۔

بندۂ مؤمن کے پانچ دشمن

ایک بندۂ مؤمن کو اپنی زندگی اور ایمانی ترقی کی راہ میں عام طور پر پانچ دشمنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پہلا دشمن تو اس کی خواہشات نفس ہیں، دوسرا دشمن شیطان ہے، تیسرا دشمن کفار ہیں، چوتھا دشمن منافقین ہیں، اور پانچواں دشمن ظالم وفاسق افراد ہیں، ایمان کا مطالبہ یہ ہے کہ ان پانچوں دشمنوں سے جہاد اور مقابلہ کیا جائے، مگر جہاد کی نوعیت الگ الگ ہوگی جس کی کچھ وضاحت ذیل میں کی جارہی ہے۔

(۱) جہادِ نفس:

اس کی چند صورتیں ہیں:

(۱) حصول علم دین: یعنی قرآن وسنت اور سیرت صحابہ وسلف صالح کی روشنی میں دین حق اور ہدایت کو سیکھا جائے، تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ نفس کی خواہشات کو لگام دی جاسکے گی، حصولِ علم جہادِ نفس کا نقطۂ آغاز ہے، جہالت عام طور پر نفسانی خواہشات کا غلام اور اسیر بنادیتی ہے۔

(۲) عمل صالح پر مداومت: علم ومعرفت اس وقت تک سودمند اور بارآور نہیں ہوسکتے جب تک عمل صالح کی پابندی نہ کی جائے، بلکہ بقول عربی شاعر: ؎

لَوْ كَانَ لِلْعِلْمِ مِنْ دُوْنِ التُّقىٰ شَرَفٌ

لَكَانَ أَشْرَفَ خَلْقِ اللّٰهِ إِبْلِيْسُ

ترجمہ: اگر بغیر عمل وتقویٰ کے علم کا کوئی شرف اور مقام ہوتا تو اللہ کی مخلوق میں سب سے معزز ابلیس ہوتا۔

صحابۂ کرام کا امتیاز یہی تھا کہ وہ علم وعمل کے حیرت انگیز حد تک جامع تھے، اور واقعہ یہی ہے کہ اس جامعیت کے بغیر جہاد نفس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) دعوتِ حق: یہ بہت اہم کام ہے، خاص طور پر فتنوں اور جہالت وضلالت کے غلبے کے اس دور میں اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے، اور جہاد نفس کی تاثیر و تکمیل میں اسے اساسی مقام حاصل ہے۔

(۴) راہِ دعوت کی مشقتوں پر صبر: اس راہ میں مزاحمتوں اور مشقتوں کا پیش آنا یقینی امر ہے، ایک مجاہد جبھی کامیاب ہوگا جب وہ ان دشواریوں کو راہِ حق کا تحفہ سمجھ کر برداشت کر لے۔

(۲) شیطان سے جہاد:

یہ بالکل واقعہ ہے کہ شیطان مردِ مؤمن کا ازلی ابدی دشمن ہے، اس نے اسے گمراہ کرنے کی روزِ اول سے قسم کھا رکھی ہے اور اس مہم میں مکمل سرگرم بھی ہے، اہل ایمان کا یہ عقیدہ ہے کہ شیطان ان کا کھلا ہوا دشمن ہے، وہ گناہوں کو خوشنما کر کے پیش کرتا ہے، انسان کے اندر سے احساسِ گناہ ختم کرنا چاہتا ہے، اور جنت کی راہ سے ہٹا کر جہنم کی راہ پر چلانے کا آرزومند رہتا ہے، قرآن کی تقریباً سو آیات میں شیطان کا نام لے کر اس کی گمراہ کرنے کی مہم کا ذکر ہے اور اہل ایمان کو شیطان سے بچنے اور اس کی وسوسہ اندازیوں کا مقابلہ کرنے کا حکم ہے۔

شیطان کا سب سے بڑا وسیلۂ تضلیل خواہشِ نفس ہے، جو خواہشِ نفس کا پیرو ہے وہ فی الواقع شیطان کا غلام ہے، تکبر و گھمنڈ بھی شیطانی گمراہ کاری کا اہم ذریعہ ہے، شیطان سے جہاد کا جو حکم ملا ہے اس کے دو قوی ہتھیار بھی بتائے گئے ہیں: (۱) ذکر (۲) فکر۔ ذکر الٰہی اور اللہ کو ہمہ وقت یاد اور مستحضر رکھنے کی برکت اور فکر و عقل سلیم کی نصرت وقوت سے شیطان کی وسوسہ اندازیوں، گناہوں کی ملمع کاریوں کا پردہ چاک کیا جا سکتا ہے، اور ان سے اپنے کو بچایا جا سکتا ہے، ساتھ ہی توبہ، رجوع الی اللہ، استغفار، شیطان اور اس کے شر و وسوسے سے پناہ

طلبی اور معاصی پر ندامت بھی وہ طریقے ہیں جو شیطان کا وار کند ونا کام بناتے ہیں۔

(۳) کافروں سے جہاد:

اہلِ کفر و باطل اہل حق کے دشمن ہوتے ہیں، اہل ایمان کو ان سے جہاد کا حکم ہے، مگر مرحلہ بندی کردی گئی ہے، سب سے پہلے دعوتی وقرآنی جہاد کرنا ہے یعنی افہام وتبلیغ، یہ بے اثر ہوتو دوسرا مرحلہ عملی جہاد کا ہے اور کفر کی طاقت کو ختم کرنے کا ہے، دعوتی جہاد تو ہر جگہ اور ہر حالت میں ہوسکتا ہے، عملی جہاد کے لئے یہ شرط ہے کہ اہل ایمان مقابلے کی پوزیشن میں ہوں، ورنہ اگر اہل ایمان بالکل کمزور ہوں تو مکی زندگی کا صبر وثبات نمونہ کے طور پر موجود ہے۔

(۴) منافقوں سے جہاد:

اہل حق کے لئے سب سے خطرناک اور زہریلا گروہ مارِ آستین منافقوں کا ہوتا ہے جن کے ظاہر و باطن میں تضاد ہوتا ہے، وہ زبانی مدعیٔ ایمان ہوتے ہیں، مگر ان کے دل کفر سے لبریز ہوتے ہیں، ان کے اندر بے حد مکر وغدر کے اوصاف ہوتے ہیں، اور وہ فتنہ واختلاف بھڑکانے کے عادی ہوتے ہیں، ساتھ ہی وہ بے انتہا بزدل، فحش پسند، افواہ پھیلانے والے اور معاند ہوتے ہیں، اہل ایمان کو ان سے جہاد کا صریح حکم ہے، اگر مسلمان کمزور ہوں تب تو ان کو حکم ہے کہ وہ عملی جہاد نہ کریں بلکہ منافقوں سے چوکنے رہیں اور صبر سے کام لیں، اور اگر طاقت ور ہوں تو عملی جہاد کے ذریعہ ان کا کام تمام کردیں، اہل ایمان سے ایمان کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اہل نفاق سے دوستی نہ رکھیں، قریب نہ ہوں، ان کا بائیکاٹ کریں، ان پر اعتماد نہ کریں، جہاد کے موقعے پر انہیں ساتھ نہ لیں، اہم معاملات ان سے مخفی رکھیں، ساتھ ہی حسبِ موقع انہیں سمجھائیں، اللہ کے عذاب سے ڈرائیں اور اخلاصِ ایمانی

کی دعوت دیں۔

(۵) ظالموں اور فاسقوں سے جہاد:

اہل اسلام کو یہ حکم بھی ہے کہ اپنے ظالم اور فاسق بھائیوں سے بھی جہاد کریں، یہ جہاد دعوتی ہوگا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کا ذریعہ ہے، حسبِ طاقت ہاتھ یا زبان یا دل سے منکر کی تبدیلی کا حکم ہے، اور اس کے بڑے فضائل احادیث میں آئے ہیں اور اس کو چھوڑنا سخت جرم بتایا گیا ہے۔

ایک بندۂ مؤمن اگر اپنی عملی زندگی میں ان پانچوں طرح کے جہاد کو اختیار کرلے تو اس کی ایمانی قوت اور خوش بختی کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

سب سے بیش قیمت سرمایہ صالح افراد ہیں

تاریخ کے ہر دور میں ہر قوم وملت کو ایسے صالح، نیک طینت، پرہیزگار اور وفا شعار افراد کی ضرورت رہی ہے جو اس کی قیادت کر سکیں، اس کو منجدھار سے نکال سکیں، اس کے مسائل ومشکلات کا سنجیدگی سے جائزہ لیں اور عملی اقدامات کریں، ایسے افراد کے وجود سے امت میں جو توانائی، خود اعتمادی اور بیداری پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور چیز سے نہیں پیدا ہو پاتی، سب سے بیش قیمت چیز یہی جاں باز افراد ہوتے ہیں، مال ودولت کے انبار ان کے سامنے بے اہمیت ہوتے ہیں۔

ایسے مخلص افراد کی جب تک قدر دانی، حوصلہ افزائی اور مدد ہوتی ہے قوم ترقی واقبال کی شاہراہوں پر چلتی جاتی ہے اور جب ان کی ناقدری، حوصلہ شکنی اور مخالفت ہوتی ہے، ان کی جگہ نااہل خوشامد پسند خود غرض افراد آجاتے ہیں تو قوم زوال وانحطاط کے دلدل میں پھنستی چلی جاتی ہے۔

مخلص افراد قوم کا سب سے قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں اور اُن کے دَم سے قومیں آباد رہتی ہیں، امام بخاریؒ نے تاریخ صغیر میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں اہل نظر کے لئے کافی سامانِ عبرت ہ۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار اپنے اصحاب سے کہا کہ آج تم لوگ اپنی تمنائیں اور آرزوئیں بیان کرو، اس پر ایک شخص نے کہا کہ میری آرزو یہ ہے کہ یہ گھر مال ودولت سے بھرا ہوتا اور میں اُسے راہِ خدا میں خرچ کرتا۔ دوسرے شخص نے کہا کہ میری خواہش یہ ہے کہ اس مکان کے برابر سونا ہوتا اور میں اُسے اللہ کے راستے میں صرف کرتا۔

تیسرے نے کہا کہ میری طلب یہ ہے کہ اس گھر کے برابر جواہرات ہوتے اور میں انہیں فقراء میں تقسیم کردیتا۔ آخر میں سب کی تمنائیں سن لینے کے بعد حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''میری تمنا یہ ہے کہ یہ مکان ابوعبیدہ بن جراح، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم جیسے افراد سے بھرا ہوتا اور میں انہیں اللہ کی اطاعت میں استعمال کرتا''۔ (التاریخ الصغیر/۲۳۳)

حضرت عمرؓ نے تین صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا نام لے کر یہ واضح کردیا کہ کام کا انسان سب سے قیمتی دولت ہے، اور یہ ایسا گوہر ہے جو نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے، اوراس کی قدر بھی خال خال ہی لوگ کر پاتے ہیں: ع

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں خود زبانِ رسالت سے یہ الفاظ جاری ہوئے کہ ہر امت میں کوئی نہ کوئی امین ہوتا ہے اوراس امت کے امین ابوعبیدہ بن جراح ہیں، تاریخ اسلامی میں ان کی امانت وصلاح، جانبازی ودلیری، قربانیوں اور ایثار کی داستان ثبت ہے، جنگ بدر میں اپنے کافر باپ کو مار کر انہوں نے یہ ثابت کردیا کہ ان کا جوشِ توحید نسبی تعلق وقرابت پر غالب ہے، انہوں نے اپنے باپ کی صورت میں شرک کو قتل کیا تھا، چنانچہ قرآن کریم کی سورۂ مجادلہ کی آخری آیت میں اس کا ذکر آیا اور اللہ نے یہ اعلان کردیا کہ اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں، وہ اللہ کے گروہ میں ہیں جس کا مقدر فلاح وکامرانی ہی ہے، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی خداترسی، اتباع سنت، تواضع وزہد اور حلم وتحمل بہت معروف ہیں۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ بقول رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امتِ محمدیہ میں حلال وحرام کو سب سے زیادہ جاننے والے صحابی ہیں، انہیں یمن کا والی بنایا گیا، ان کے زہد واستغناء کے متعدد واقعات محفوظ ہیں۔

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اتنے قابل اعتماد صحابی تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنے راز بتادیا کرتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے فرمایا کہ حذیفہ تم سے جو بیان کریں اس کی تصدیق کرو، منافقین کی پوری فہرست ان کے پاس رہا کرتی تھی، اتباع سنت ان کا ایک خاص وصف تھا، یہ واقعہ مشہور ہے کہ انہیں ایران میں کسریٰ کی طرف سے مذاکرات کے لئے دعوت دی گئی، کھانا لایا گیا، آپ نے کھانا شروع کیا، درمیان میں ایک لقمہ آپ کے ہاتھ سے نیچے گر گیا، اس وقت آپ کو وہ حدیث یاد آئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر نوالہ نیچے گر جائے تو اسے اٹھالو، صاف کر کے کھالو، ضائع نہ کرو، کیونکہ وہ اللہ کا رزق ہے، اور کیا معلوم کہ اللہ نے رزق کے کس حصے میں برکت رکھی ہے، چنانچہ حضرت حذیفہ نے نیچے گرا ہوا لقمہ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا، بغل میں موجود شخص نے کہنی مار کر آپ کو اشارہ کیا کہ یہ شاہِ کسریٰ کا دربار ہے، یہاں اگر تم نیچے گرا لقمہ اٹھاؤ گے تو ذلیل و بے وقعت سمجھے جاؤ گے، اس پر حضرت حذیفہ نے جواب دیا کہ کیا میں اِن احمقوں کی وجہ سے اپنے محبوب پیغمبر کی سنت چھوڑ دوں؟ یہ حقیر و ذلیل سمجھیں یا باعزت و شریف، میں سنت پر عمل سے دستبردار نہیں ہوسکتا، چنانچہ پھر اسی اتباع سنت کی برکت سے انہوں نے ایران کو فتح کرلیا۔

ان تین صحابہ کرام کی زندگیاں نمونہ تھیں، اسی لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میری آرزو یہ ہے کہ ایسے افراد کی کثرت ہو، واقعہ یہی ہے کہ ہمارے معاشرے کا بگاڑ اسی وقت دور ہوگا اور ہمارا زوال اسی وقت ختم ہوگا جب ایسے جیالے اور تقویٰ شعار افراد قائدانہ مقام پائیں گے، ضرورت ایسے افراد کو تیار کر کے میدانِ عمل میں لانے اور ان کی رہنمائی میں عملی اقدامات انجام دینے کی ہے، خاموشی اور غفلت وہ جرم ہے جو معاف نہیں ہوسکتا۔

عصرِ حاضر کا شرک

ترقی یافتہ صنعتی انقلاب سے دوچار دنیا کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مادّیت کی یلغار نے انسان کو اتنا اپنے بس میں کرلیا ہے کہ وہ طبعی و مادّی وفنی اسباب کو خدا سمجھ بیٹھا ہے، عصر حاضر کا یہی وہ شرک ہے جس میں آج کی مادّی تہذیب مبتلا ہے۔

بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ:

''عہد حاضر کے انسان نے اپنی پوری زندگی ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ زندگی اور موت، کامیابی وناکامی، اقبال وادبار، خوش نصیبی وبدنصیبی سب ان کے ہاتھ میں ہے، اسباب مادّی، کائناتی قوتوں اور نیچر کی یہ پرستش وتقدیس اور اہل اختصاص اور ماہرین فن پر اعتمادِ کلی اور ان کو خدا کے درجہ پر رکھنا ایک نئی وثنیت اور نیا شرک ہے، اس نے قدیم بت پرستی کے ذخیرہ میں ایک نئی قسم کی بت پرستی کا اضافہ کیا ہے جو ایمان اور عبدیت کی حریف ہے''۔ (معرکۂ ایمان ومادّیت/۸۳)

قرآن کریم میں اس شرک کی تردید کا مضمون جابجا آیا ہے، قرآن کی اصطلاح میں دنیوی زندگی جلد ختم ہونے والی کھیتی کے مانند ہے، دنیوی زندگی اور مادّیت کی چمک دمک جس کو منفعت پرست ولذت پسند افراد اپنا مرکز ومعبود باور کرتے ہیں، قرآن کی زبان میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے اللہ نے پانی برسایا، جس کی وجہ سے زمین خوب پھلی پھولی لیکن پھر سب کچھ ریزہ ریزہ ہوگیا، ایسے ہی دنیوی زندگی بھی فنا ہونے والی ہے، سورۂ کہف میں باغ والے کا واقعہ ذکر ہوا ہے، اللہ نے اس پر اپنی نعمتیں انڈیل دی تھیں، انگور کے دو باغ عطا کئے، باغوں کو خرموں سے گھیر دیا، درمیان میں کھیتی بھی تھی، باغوں میں بلا کسی نقصان اور کمی کے پورا

پھل آتا تھا، باغوں کے درمیان نہر جاری کردی تھی، اس کے علاوہ مزید مال وزر اور دولت سے نوازا تھا، ان سب نوازشوں کا تقاضا یہ تھا کہ وہ شکر ادا کرتا، مگر اس نے تکبر کیا، اپنے مال کی کثرت پر اکڑ دکھائی، قیامت کا انکار کیا، اللہ کی قدرت مطلقہ کا منکر ہوگیا، اس کے موحد ساتھی نے اسے سمجھایا اور کفر وناشکری اور غرور وتکبر کی بدانجامی سے ڈرایا مگر اسے ہوش نہ آیا، بالآخر اللہ نے اپنا عذاب بھیج دیا، اس کا باغ اور سارا مال ختم ہوگیا اور وہ ہاتھ ملتا رہ گیا، اور کہنے لگا کہ کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا، معلوم ہوا کہ اس کا شرک یہ تھا کہ اس نے اسبابِ ظاہر کو تمام خوشحالی اور دولت کا سرچشمہ سمجھ لیا تھا، اور اللہ کو فراموش کر بیٹھا تھا، یہی مادّہ پرستی کا شرک ہے جو عصر حاضر کا بہت بڑا ناسور ہے۔

مدعیانِ اسلام کی اکثریت اس شرک میں عملی طور پر مبتلا ہے، قرآنِ کریم اسی کی بیخ کنی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ، وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى.

ترجمہ: دنیوی زندگی کا ساز وسامان بے مایہ ہے، خدا ترسوں کے لئے آخرت بدرجہا بہتر ہے۔

مادّہ پرستی کا طوفان

اس وقت پوری دنیا سر سے پیر تک پوری طرح سے مادّہ پرستی کے عمیق اور مہیب گڈھے میں گرتی جا رہی ہے، مال و دولت ہی کو ہر چیز کے حسن و قبح کا معیار قرار دیا جاتا ہے، روحانیت اور پاکیزگی کے الفاظ موجودہ نظریات کے لغت میں اجنبی سمجھے جاتے ہیں، ہر چیز کو مادّیت کے پیمانوں سے ناپا جاتا ہے، معرکے اور لڑائیاں بھی مادّیت ہی کے مقصد سے لڑی جاتی ہیں، حصولِ تعلیم کا بھی منشا اب حصولِ مال وزر بن گیا ہے، مالی فائدوں سے لبریز چیز بہتر اور اس سے خالی چیز بدتر گردانی جاتی ہے، حتیٰ کہ اگر آپ کسی دوست کو خوبصورت گلاب تحفہ میں دیں تو وہ اس کی قیمت کے اندازوں میں لگ جاتا ہے اور گلاب کی خوبصورتی، ہدیہ کے پیچھے مخفی جذبۂ محبت و تعلق سب سے لاتعلق ہو کر صرف مادّی قیمت کے اندازے کو پیش نظر رکھتا ہے، مادہ پرستی کے طوفانِ بلاخیز کا یہ ایک نمونہ ہے، ورنہ فی الواقع اب ہر شعبۂ زندگی میں اس طوفان نے اپنے پنجے اس طرح گاڑ دیئے ہیں کہ اس سے رُستگاری بے حد دشوار نظر آتی ہے۔

مسجدیں اور عبادت گاہیں تک اس کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں، ادیب و فنکار افراد کا طبقہ اس کے نرغے میں بری طرح پھنسا ہوا ہے، ادباء کی قلمی تخلیقات اجرتوں اور معاوضوں کی مقدار کے لحاظ سے سامنے آتی ہیں، جتنی زیادہ اجرت دی جاتی ہے تخلیق میں ادیب اتنی ہی زیادہ سحر اثری پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، مادّہ پرستی ہی کا اثر ہے کہ اب ادباء تعمیری، سنجیدہ اور مثبت موضوعات کے بجائے غیر سنجیدہ موضوعات، ناول، ڈراموں وغیرہ پر توجہات مرکوز رکھتے ہیں، فحش نگاری کی قدر اسی لئے بڑھ گئی ہے کہ اس راہ سے مادی آمدنی زیادہ ہوتی ہے۔

مادہ پرستی میں پور پور غرق سماج تاریکیوں اور ظلمتوں میں محبوس اور روشنی سے محروم و تہی داماں رہتا ہے، اور پھر اس کے مسموم اثرات سے پورے پورے علاقے متأثر ہوتے ہیں، مادّہ پرستی کا سرا براہِ راست جہالت اور حقیقت نا آشنائی سے ملتا ہے، انسان جب وقتی لذتوں کو دائمی اور فانی چیزوں کو ابدی باور کرنے لگتا ہے تو پھر وہ وقتی مادّی چیزوں ہی کے پیچھے دوڑتا رہتا ہے، نفس وشیطان کے بہکاوے اور دامِ تحریص میں وہ الجھتا اور پھنستا چلا جاتا ہے۔

حالانکہ اگر عقلِ سلیم کا استعمال کیا جائے تو یہ حقیقت بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دنیوی رونقیں محض سراب ہیں، ان کے وجود کو کوئی قرار و دوام نہیں ہے، وہ بہت جلد ختم ہو جاتی ہیں، ان کی مثال قرآن کی زبان میں ایسی ہے جیسے کہ بارش ہوتی ہے، اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہوتے ہیں، پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ زرد ہو جاتی ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے۔

دنیاوی رونقوں کا حال یہی ہے کہ وہ ناپائیدار چیزیں ہیں، کوئی صاحب عقل باہوش انسان کبھی ان کے فریب میں آکر دائمی وسرمدی چیزوں سے کنارہ کش اور فانی چیزوں کی طرف راغب وفریفتہ نہیں ہوسکتا، اب جو لوگ ان وقتی رونقوں کے فریب میں گرفتار اور اصل چیزوں سے بیزار ہیں وہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس درجہ بے عقلی میں مبتلا ہیں؟ مادّہ پرستی اور بے عقلی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک کو دوسرے سے کبھی بھی کسی طرح الگ نہیں کیا جاسکتا۔

زاہد کے اوصاف

ارشادِ نبوی ہے:

أَزْهَدُ النَّاسِ مَنْ لَمْ يَنْسَ الْقَبْرَ وَالْبِلىٰ وَتَرَكَ أَفْضَلَ زِيْنَةِ الدُّنْيَا، وَآثَرَ مَا يَبْقىٰ عَلىٰ مَا يَفْنىٰ، وَلَمْ يَعُدَّ غداً مِنْ أَيَّامِهِ، وَعَدَّ نَفْسَهُ فِيْ الْمَوْتىٰ. (فيض القدير: ١/٦١٧ بحواله شعب الايمان للبيهقي)

ترجمہ: لوگوں میں سب سے بڑا زاہد وہ ہے جو قبر اور بوسیدگی کو فراموش نہ کرے، دنیوی زندگی کی عمدہ ترین آرائش وزیبائش کو چھوڑ دے، باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دے، اپنی زندگی کے اگلے دن کو شمار نہ کرے، اور اپنا شمار مردوں میں کرلے۔

زہد کی حقیقت یہ ہے کہ انسان دنیوی لذتوں میں اشتغال سے آخرت کے لئے بے رغبت ہوجائے اور عیش وتنعم کی زندگی سے دست بردار ہوجائے، قرآن وحدیث کے متعدد نصوص میں زہد کی تلقین وتعریف کا مضمون اور اس کے فوائد واثرات کا بیان آیا ہے اور دنیوی لذتوں میں انہماک سے سختی سے روکا اور اس کی مذمت ومضرت کا ذکر کیا گیا ہے۔

زہد کو خدا اور خلق خدا کی محبوبیت کا ذریعہ بتایا گیا ہے، حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب سے فرمایا:

اِزْهَدْ فِيْ الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللّٰهُ، وَازْهَدْ فِيْ مَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبَّكَ النَّاسُ. (ترمذی شریف)

ترجمہ: دنیا کی طرف سے اعراض اور بے رخی اختیار کرلو، تو اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا، اور جو (مال وجاہ) لوگوں کے پاس ہے اس سے اعراض اور بے رخی اختیار کرلو، تو لوگ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

احادیثِ شریفہ میں یہ بھی آیا ہے کہ:

مَا زَهِدَ عَبْدٌ فِيْ الدُّنْيَا إِلَّا أَنْبَتَ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فِيْ قَلْبِهٖ، وَأَنْطَقَ بِهَا لِسَانَهٗ، وَبَصَّرَهٗ عَيْبَ الدُّنْيَا وَدَاءَ هَا، وَأَخْرَجَهٗ مِنْهَا سَالِماً إِلىٰ دَارِ السَّلَامِ. (شعب الایمان / بیهقی)

ترجمہ: زہد اختیار کرنے والے کو منجانب اللہ حکمت القا کی جاتی ہے، اس کی زبان پر کلماتِ حکمت جاری کردیئے جاتے ہیں، اس کی نگاہوں کے سامنے دنیا کے عیوب ومفاسد آجاتے ہیں، اور دنیا سے اس کو سلامتی کے ساتھ نکال کر جنت میں پہنچادیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا حدیث میں یہ بتایا گیا کہ لوگوں میں سب سے بڑا زاہد وہی ہے جو پانچ اوصاف کا حامل ہو۔

(۱) قبر اور بوسیدگی کو فراموش نہ کرے:

یعنی موت، عالمِ قبر وبرزخ، قبر کی وحشت وہولناکی اور تنہائی کو یاد رکھے اور یہ فراموش نہ کرے کہ اسے اس دنیا سے رخصت ہونا ہے، اور فنا ہونا ہے، دوام کسی کو میسر نہیں ہے، احادیث میں موت کو ”هَاذِمُ اللَّذَّاتِ“ (لذتوں کو ختم کرنے والی) کہا گیا ہے اور اسے بکثرت یاد کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ (ترمذی شریف)

قبروں کی زیارت کا جو حکم ہے اس کے متعدد مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خوف پیدا ہو اور قبر وموت کی یاد دہ تازہ رہے جس کا نتیجہ اعمال صالحہ کی صورت میں ظاہر ہوگا، موت

سے غفلت انسان کے دنیادار ہونے اور شقی القلب ہونے کی دلیل ہے، جب کہ موت کی یاد اور اس کی تیاری انسان کے دانش مند و ہوشیار رہنے کی دلیل ہے۔

(۲) دنیوی زندگی کی عمدہ ترین آرائش کو چھوڑ دے:

دنیوی زندگی کی زیب وزینت اور متاع ودولت عارضی اور بے مایہ ہے، اسی لئے احادیث وآیات قرآنیہ میں دنیوی آرائشوں سے اور اس میں انہماک سے شدت سے منع کیا گیا ہے، اور یہ بتایا گیا ہے کہ طالب دنیا کا دل ہمیشہ پراگندہ، بے سکون اور غیر مطمئن رہتا ہے، اور مال ودولت کے پرستار پر لعنتِ خداوندی ہوتی ہے، بقدرِ کفاف پر رضا وقناعت اور دنیا طلبی سے دوری قابل تعریف عمل اور رحمت الٰہی کا ذریعہ اور فلاح وکامرانی کا وسیلہ ہے۔

(۳) باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی چیز پر ترجیح دے:

باقی رہنے والی چیز آخرت ہے، اور فنا ہونے والی چیز دنیا ہے، قرآن وحدیث میں دنیا کو متاع، لہوولعب، فریب، اور وقتی زینت بتایا گیا ہے جب کہ آخرت کو دار القرار، خیر و پائندہ تر، اور افضل واشرف بتایا گیا ہے، اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ انسان دنیا کو بالکل حقیر و بے قیمت سمجھے، اور اس سے جی نہ لگائے، اسے عبرت کی جگہ سمجھے، اسے اپنا مقصود ومطلوب نہ بنائے، بلکہ آخرت کو اپنا دائمی وطن، اصل مقام، حقیقی منزل سمجھے، اور وہاں کی کامیابی کے حصول کی فکر ومحنت میں لگا رہے، احادیث میں آیا ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں اللہ کی نگاہ میں مچھر کے پَر کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی، اور دنیا مؤمن کے لئے قید خانہ وجیل ہے، یا سرائے خانہ ہے، ایک حدیث میں فرمایا گیا:

مَنْ أَحَبَّ دُنْيَاهُ أَضَرَّ بِآخِرَتِهِ، وَمَنْ أَحَبَّ آخِرَتَهُ أَضَرَّ بِدُنْيَاهُ، فَآثِرُوْا مَا يَبْقىٰ عَلىٰ مَا يَفْنىٰ. (مسند احمد)

ترجمہ: جو شخص دنیا کو اپنا محبوب ومطلوب بنائے گا وہ اپنی آخرت کا ضرور نقصان کرے گا، اور جو کوئی آخرت کو محبوب بنائے گا وہ اپنی دنیا کا ضرور نقصان کرے گا، پس فنا ہو جانے والی دنیا کے مقابلہ میں باقی رہنے والی آخرت کو ترجیح دو۔

لہٰذا آخرت کو دنیا پر ترجیح دینا ہی زہد کا تقاضا ہے، بعض حکماء کا مقولہ ہے کہ "اگر دنیا فنا ہونے والے سونے سے بنی ہو اور آخرت باقی رہنے والے ٹھیکرے سے بنی ہو تب بھی عقل مند باقی کو فانی پر ترجیح دے گا۔

(۴) اپنی زندگی کے اگلے دن کو شمار نہ کرے:

یعنی موت کو ہمہ وقت نگاہوں کے سامنے رکھے، اور ہر آن یہ ذہن میں رکھے کہ اس کی موت قریب ہے، اور یہ تصور رہے کہ اگلا دن زندگی کا نہیں موت کا ہے، اور ہر عمل مابعد موت زندگی کے لئے انجام دے، یہی زہد وتقویٰ کی علامت ہے۔

(۵) اپنا شمار مُردوں میں کرے:

دنیا کی زیب وزینت سے دست کش ہونا اور آخرت کی ہر دم تیاری میں لگے رہنا لازمی طور پر اللہ سے ملاقات کی محبت بڑھاتا ہے، اور اللہ سے ملاقات کی محبت کا لازمی نتیجہ دنیا سے جانے اور آخرت میں پہنچنے کی خواہش ہے، اور یہ زہد کا اعلیٰ مقام اور آخری منزل ہے کہ انسان بس اللہ ہی میں فنا ہو جائے اور اس سے لقاء ووصل کا آرزومند ہو جائے۔

زبان کی حفاظت کی اہمیت

زبان انسان کے جسم کا بہت قیمتی اور اہم عضو ہے، اور قرآن وحدیث کے نصوص میں زبان کی حفاظت کا تاکیدی حکم بے شمار مقامات پر آیا ہے، زبان کی اہمیت کا اندازہ اِس حدیث نبوی سے لگایا جاسکتا ہے کہ:

''جب انسان صبح کرتا ہے تو اس کے جسم کے تمام اعضاء زبان کے سامنے جھک جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ہمارے بارے میں اللہ سے ڈرو، ہم تمہارے دَم سے ہیں، اگر تم درست رہو گی تو ہم بھی درست رہیں گے اور اگر تم کجی اختیار کرو گی تو ہم بھی کج ہو جائیں گے''۔ (بخاری شریف)

زبان کی بے احتیاطیوں سے بچنا بیحد مشکل کام ہے، اسی لئے اس کی بیحد تاکید آئی ہے، اور زبان سے بے حد خائف اور محتاط رہنے کی ہدایت کی گئی ہے، ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

''مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ خوف زبان کی بے احتیاطیوں کا ہے''۔ (ترمذی شریف)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ دعا بھی شامل تھی کہ اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں اپنے کان، آنکھ، زبان، دل اور منہ سبھی کے شر سے، احادیث میں مؤمن اور منافق کا ایک نمایاں فرق یہ بھی بیان ہوا ہے کہ مؤمن خاموش طبع محتاط اور بھلی بات بولنے والا ہوتا ہے، اور اس کی زبان درازیوں سے سبھی محفوظ رہتے ہیں، جب کہ منافق زبان دراز، بدگو اور شرّی ہوتا ہے۔

زبان کی آفات کا دائرہ بے حد وسیع ہے، جس میں شرکیہ کلمات، جھوٹ، غلط فتویٰ، ناحق فیصلہ، غیر اللہ کے لئے نذر ومنت، ناشکری، جھوٹی قسم، غیر اللہ کے نام سے قسم، تقدیر کا انکار، قولی بدعات، جھوٹی گواہی، تہمت، دوسرے کی پردہ دری اور معایب کی تشہیر، افترا پردازی، دشنام طرازی، چغل خوری، غیبت، افشاءِ راز، مذاق واستہزاء، گانا، ناحق مذاق، لعن طعن، نوحہ خوانی، بیجا تعریف، وغیرہ سبھی شامل ہیں، اور احادیث میں ان سب کی نام بہ نام صراحت کے ساتھ ممانعت اور مذمت کا مضمون جا بجا آیا ہے۔

زبان کی بے احتیاطیوں سے نجات کا طریقہ اور علاج یہ ہے کہ آدمی اللہ کی عظمت کا تصور کرے، اس کی قدرتِ کاملہ پر یقین کر لے، ثواب وعذاب کا علم اسے ہو، موت یاد کرے، جن آیات واحادیث میں زبان کی حفاظت کا حکم ہے انہیں بغور دیکھے اور پڑھے اور دل میں بٹھائے، نماز کا اہتمام کرے، دعاؤں میں لگ جائے، خاموشی اختیار کر لے، بے ضرورت نہ بولے، جب بولے بھلی بات بولے، اہلِ تقویٰ کی ہم نشینی اختیار کرے، حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے سرگرم ہو جائے، نیک کاموں میں مشغول ہو جائے، صبر کو اپنا شعار بنائے، اور خلوت گزینی کا عادی ہونے کی کوشش کرے۔

زبان کی حفاظت کا اہتمام کرنے اور احتیاط برتنے کے بے شمار فائدے ہیں، سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اللہ کی خوشنودی میسر آتی ہے جو ہر مسلمان کا اولین مطلوب ہے، زبان کے سلسلے میں محتاط آدمی زبانِ نبوت میں سب سے افضل مسلمان ہے، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا قریب ہے اور ان کا محبوب اور لاڈلا ہے، خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے جنت کی ضمانت لی ہے، اور عذاب الٰہی سے نجات کا مژدہ سنایا ہے، اور اسے افضل ترین مجاہد بتایا ہے۔

اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ خلقِ خدا کے ساتھ تعلقات خوشگوار ہوتے ہیں، باہم

محبت بڑھتی ہے، معاشرتی زندگی پُرسکون ہوتی ہے، اور خود آدمی متنوع پریشانیوں اور مشکلات سے محفوظ ہوجاتا ہے، مزید براں وہ اللہ کا محبوب بن جاتا ہے اور محبوبیت الٰہی کے نتیجے میں محبوبِ ملائکہ بھی بن جاتا ہے اور پھر پوری روئے زمین میں اس کی مقبولیت ومحبوبیت کا انتظام من جانب اللہ کردیا جاتا ہے۔

دوسری طرف زبان کی بداحتیاطی کے بہت برے نتائج ہوتے ہیں، اللہ کا غضب اترتا ہے، زبان کے لحاظ سے غیرمحتاط آدمی اللہ کا، فرشتوں اور انسانوں کا مبغوض ہوجاتا ہے، اور حدیث کے بموجب ایسے آدمی کا ٹھکانہ جہنم ہوگا جہاں اسے چہرے کے بل دھکیل دیا جائے گا وہ عذابِ قبر میں بھی مبتلا ہوگا، دنیا میں وہ پریشانیوں کا شکار ہوگا اور دوسروں سے اس کے تعلقات بگڑ جائیں گے۔

اسلاف میں سے کسی کا قول ہے کہ ''مؤمن بولتا کم اور کرتا زیادہ ہے، اسی لئے لغزشوں سے مامون رہتا ہے، اور منافق کرتا کم اور بولتا زیادہ ہے، اسی لئے وہ بہت لغزشوں میں مبتلا ہوتا ہے'' اور ''جسم انسانی میں دوٹکڑے ہیں زبان اور دل، یہ دونوں اگر ٹھیک ہیں تو سب ٹھیک ہے، اور ان دونوں میں اگر فساد آگیا تو کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے''۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ زبان کی احتیاط آدمی کے لئے ہر لحاظ سے خیروبرکت کی باعث اور مفید چیز ہے، اور زبان کی بےاحتیاطی بےحد ضرررساں اور مہلک چیز ہے۔

قول وعمل کی ہم آہنگی

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد اپنے پہلے اور مختصر خطاب میں فرمایا تھا:

أَنْتُمُ الْيَوْمَ إِلىٰ إِمَامٍ فَعَّالٍ أَحْوَجُ مِنكُمْ إِلىٰ إِمَامٍ قَوَّالٍ.

ترجمہ: آج تم کو کہنے والے امام سے کہیں زیادہ کرنے والے امام کی ضرورت ہے۔

حضرت عثمان کا یہ بلیغ جملہ ہمارے اس دور میں جیسی مطابقت رکھتا ہے، شاید ایسی مطابقت کسی دور میں نہ رہی ہوگی۔

قوالیت اور قوالیت پسندی ہم مسلمانوں کی بیماریوں میں بیحد قابل فکر بیماری ہے، قول وعمل کا تضاد سب سے بڑا انسانی روگ ہے، یہ نفاق کی بدترین صورت ہے، قرآن میں یہود کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

أَتَـأْمُـرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ أَفَلاَ تَعْقِلُوْنَ. (البقرة: ٤٤)

ترجمہ: تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لئے کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو، کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟

مسلمانوں کو مخاطب کیا گیا:

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ، كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللّٰهِ

أَنْ تَقُوْلُوْا مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ.　　　(الصف: ۲-۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔

اس آیت میں صاف واضح کردیا گیا ہے کہ ایک سچے مسلمان کے قول وعمل میں مکمل مطابقت ہونی چاہئے، جو کہے اسے کرے، جو کرنے کی نیت یا ہمت نہ ہو اسے زبان سے نہ کہے، قول وعمل کا تضاد بدترین خصلت ہے جو اللہ کی مبغوضیت کا سبب بنتی ہے، دوسروں کی اصلاح کے لئے سرگرمی اور اپنی اصلاح سے بےفکری خودرا فضیحت دیگراں را نصیحت کا انجام بیحد عبرتناک ہوتا ہے، حضرت اسامہؓ کی حدیث ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے دن ایک شخص کو لاکر دوزخ میں ڈال دیا جائے گا تو آگ میں (شدتِ عذاب کی وجہ سے) اس کی آنتیں باہر نکل آئیں گی، اہل دوزخ اس کے پاس جمع ہوکر کہیں گے تمہارا کیا حال ہے؟ کیا تم دنیا میں ہم کو اچھی باتوں کا حکم نہ دیتے تھے اور بری باتوں سے منع نہ کرتے تھے؟ وہ کہے گا کہ میں تم کو اچھی باتوں کا حکم تو دیتا تھا مگر خود ان پر عمل نہ کرتا تھا اور تمہیں بری باتوں سے روکتا تو تھا مگر خود ان کا ارتکاب کرتا تھا''۔　　　(بخاری شریف)

معلوم ہوا کہ قول وعمل کا تضاد جہنم کے المناک عذاب کو دعوت دیتا ہے، دوسروں کی فکر میں اپنی طرف سے بےفکری مسخرہ پن ہے، حدیث شریف میں ہے:

اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰهِ.　　　(ترمذی شریف)

ترجمہ: عقلمند وہ ہے جو اپنا محاسبہ کرلے اور آخرت کی ابدی زندگی کے لئے عمل کرلے، اور عاجز و بےبس ہے وہ جو اپنے نفس کو خواہشِ نفس کے تابع کردے

اور (بدعملیوں کے ساتھ) اللہ سے (فلاح ونجات کی) آرزوئیں باندھے۔

ایک حدیث شریف میں وارد ہوا ہے:

إِنَّمَا أَخَافُ عَلىٰ هٰذِهِ الْأُمَّةِ كُلَّ مُنَافِقٍ يَتَكَلَّمُ بِالْحِكْمَةِ وَيَعْمَلُ بِالْجَوْرِ. (شعب الایمان)

ترجمہ: مجھے اس امت پر ہر اس منافق سے اندیشہ ہے جو باتیں تو حکیمانہ کرے لیکن کام اس کے ظالمانہ ہوں۔

دانشمندانہ، فکرانگیز، حکمت پر مبنی، شیریں گفتگو ہو مگر عمل ظالمانہ وفاسقانہ ہو، زبان نبوت میں ایسے لوگ امت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں اور ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید وتلقین ہے، ایک حدیث میں ایسے لوگوں کے بارے میں آیا ہے کہ ان کی زبانیں شکر اور شہد سے زیادہ شیریں مگر دل بھیڑیوں کی طرح خطرناک ہوں گے، اور ان سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے کہ ہر نبی کی امت میں ایسے ناخلف ہوتے ہیں جو قول وعمل کے تضاد اور حکم شریعت کے عصیان میں مبتلا ہوتے ہیں، ایسے لوگوں سے اپنے ہاتھ سے جہاد (ان کی غلط کاریوں پر نکیر) کرنے والا مؤمن کامل ہے، ان سے زبانی جہاد کرنے والا درمیانی درجہ کا مسلمان ہے، اور صرف دل سے جہاد کرنے والا (دل میں ان کے عمل کو برا سمجھنے والا) ناقص مؤمن ہے، اس کے بعد ایمان رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں رہتا۔ (مسلم شریف)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیازی وصف قول وعمل کی ہم آہنگی اور قوتِ عمل تھا جس نے آپ کو ہر مرحلۂ حیات میں کامیابی سے ہم کنار کیا، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوال کے جواب میں کہا تھا:

كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ. (ابوداؤد شریف)

ترجمہ: آپ کا اخلاق قرآن ہے۔

یعنی جو کچھ قرآن میں بصورتِ الفاظ ہے وہی آپ کی سیرت وحیات میں بصورتِ عمل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم چلتا پھرتا قرآن ہیں، آپ نے جو حکم بھی دیا سب سے پہلے اور سب سے زیادہ خود اس پر عمل کرے دکھایا، غریبوں کی امداد کا حکم دیا تو پہلے خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلایا، دشمنوں کو معاف کرنا سکھایا تو پہلے خود دشمنوں کو معاف کیا، نماز کا حکم دیا تو سب سے زیادہ نمازیں خود پڑھیں، زکوٰۃ کا حکم دیا تو اپنا سب مال راہِ خدا میں قربان کر دیا، قرآن نے اسی لئے آپ کی حیات کی اخلاقیت کو آپ کے معاصرین کے سامنے نقد وتبصرہ کے لئے پیش کیا:

فَقَدُ لَبِثْتُ فِيُكُمُ عُمُراً مِنُ قَبُلِهٖ أَفَلاَ تَعُقِلُوُنَ. (یونس: ١٦)

ترجمہ: میں اس سے پہلے ایک مدت تمہارے درمیان گذار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

پھر آپ کو خطاب کر کے فرمایا:

إِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِيُمٍ. (القلم: ٤)

ترجمہ: اے محمد! یقیناً آپ اخلاق کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

قول وعمل اور گفتار وکردار کی موافقت ہی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر میدان زندگی میں نمایاں کامیابی عطا کی، اور آج بھی کامرانی کی کلید یہی موافقت ہی ہے، اسلاف کی کامیابیوں اور ظفر مندیوں پر ناز کرنے والے اور اپنے آپ کو فراموش کرنے والے افراد سے اقبال کی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ:ـــ

تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار

قول و عمل

یہ آوازیں تو آئے دن سنائی پڑتی ہیں کہ مسلمان اس وقت اپنی بے حسی اور دنیا پرستی کی آخری حدیں عبور کر رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہر جگہ بے حیثیت ہیں، مذہب بیزاری نے انہیں رسوا کر ڈالا ہے، یہ خیالات مفروضہ نہیں بلکہ حقائق ہیں جن کا مشاہدہ ہم بچشم خود جب چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن اپنی ذمہ داری بھی محض حالات کے مشاہدہ اور تبصرہ پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ خیر امت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہمیں اپنی عملی زندگی کی اصلاح کے بعد اصلاح عام کا علم لے کر اٹھ کھڑا ہونے کا ذمہ دار بھی بنایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے، ہر فرد اصلاح ذات کے بعد اصلاح عام میں دلچسپی لے گا تبھی معاشرہ سدھر پائے گا، ورنہ محض تنقید تو کچھ بھی سودمند نہیں ثابت ہو سکتی۔

مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے سے ہمارے سامنے تین طرح کے مسلمان طبقات ظاہر ہوتے ہیں، اب ہمیں ان ہی کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم کس طبقہ میں ہیں اور ہمیں کیا کرنا ہے؟ پہلا طبقہ تو ان حضرات کا ہے جن کے پاس زبانی دعوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، عمل سے ان کی زندگی بالکل خالی اور محروم ہے، بدقسمتی سے اکثریت اسی طبقہ کو حاصل ہے، ان کی دل ربا، لچھے دار اور جادو اثر گفتگو سے ہر خاص و عام متأثر ہو جاتا ہے، مسلمانوں کی حالت زار پر اظہار تاسف، فلسفۂ اسلام کی تشریح اور دانشمندانہ تجاویز پر مشتمل باتیں ان کی زبانوں سے ہمہ وقت نکلتی رہتی ہیں مگر ان کی اپنی عملی زندگی انتہا درجہ مایوس کن نظر آتی ہے، طرفہ تماشا یہ ہے کہ وہ خود اپنی ذمہ داریاں صرف قول تک محدود باور کرتے ہیں، اور

عملی زندگی کو پرسنل معاملہ کہہ کر ٹال جاتے ہیں، ہمارے معاشرہ میں دعوتی کام کرنے والے افراد کا یہی المیہ ہے کہ وہ عملی زندگی میں ناکام ہیں، ظاہر ہے کہ جب قول عمل کے سانچہ میں ڈھلا ہوا نہ ہو تو اس کی تاثیر کہاں ظاہر ہوسکتی ہے؟ اللہ نے خود اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا:

"اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں"۔ (الصّف:۳)

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کی پیشین گوئی کی ہے جو شکر سے زیادہ میٹھی زبان رکھیں گے مگر ان کے دل بھیڑیوں جیسے ہوں گے۔

دوسرا طبقہ ان حضرات کا ہے جو خاموش عمل کو ترجیح دیتے ہیں، ان کے یہاں قول کا خانہ نہیں، صرف عمل ہی عمل ہے، یہ طبقہ بجائے خود درست روش پر ہے مگر اس کا فائدہ عموماً متعدی نہیں ہو پاتا لازم رہ جاتا ہے، اس لئے شخصی پرسنل معاملات کی حد تک تو یہ نقطۂ نظر بیحد حکیمانہ ہے اور مفید ہے مگر اجتماعی ودعوتی امور میں صرف خاموش عمل ہی مؤثر نہیں ہے بلکہ مؤثر اظہار و بیان اور قول بھی اس کا لازمی جزء ہے۔

تیسرا طبقہ ان حضرات کا ہے جو قول وعمل دونوں کے جامع ہیں، موجودہ دنیا میں اسی طبقہ کی ضرورت ہے، انبیاء ومجددین، داعیان ومصلحین نے ہر دور میں ایسے ہی افراد تیار کئے ہیں اور اس وقت بھی ان ہی کو تیار کرنے کی ضرورت ہے، موجودہ حالات میں جب غیر اسلامی فلسفۂ زندگی اور مادّہ پرستانہ فکر پوری قوت سے پھیلائی جارہی ہے ایسے قول وعمل کے جامع افراد کی ضرورت روز افزوں ہے جو اپنے عمل کی اصلاح کے بعد عوام کی اصلاح کے لئے میدان میں آئیں۔

ہم جب بھی مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لیں تو پہلے اپنے آپ کو بھی دیکھیں کہ کیا ہم اس تیسرے طبقہ میں شامل ہیں؟ اگر خدانخواستہ ہم شامل نہیں ہیں تو اصلاح عام کے کام

کے ساتھ ساتھ خود کو بھی اس معیار پر کھرا ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ قول وعمل کی جامعیت ہی وہ امتیازی وصف ہے جو فاتح عالم اور مؤثر ترین ثابت ہوتا ہے، ماضی میں ہماری کامیابی ونیک نامی کی ساری داستانوں کے پس پردہ یہی عامل کارفرما رہا ہے، اور آج بھی ہماری کامیابی کی ضمانت اسی امتیازی وصف کو اپنانے ہی میں ہے۔

خوفِ خدا کی اہمیت

قرآنی تعلیمات اور نبوی ہدایات میں متعدد مقامات پر خوفِ خداوندی اور خشیتِ ربانی کی فضیلت اور اس کی تاکید و تلقین کا مضمون ملتا ہے، اور حقیقت یہی ہے کہ جس بندے میں خوفِ خدا پیدا ہوجاتا ہے وہ دنیوی واخروی ہر نوع کی فلاح اور کامرانی کا مستحق ہوجاتا ہے۔

علماء کے بیان کے مطابق خوف کی کئی قسمیں ہیں، علامہ ابن رجب حنبلی کے بقول مطلوب اور واجبی خوف وہی ہے جو فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب پر آمادہ کرے، اور اگر خوف اتنا زیادہ ہوجائے کہ وہ دلوں میں نفل عبادتوں کی انجام دہی، معمولی گناہوں اور خلاف اولیٰ امور سے اجتناب اور ضرورت سے زائد مباح امور سے پرہیز کا باعث بن جائے تو یہ قابل تعریف بات ہے، لیکن اگر خوف اس قدر بڑھ جائے کہ بیماری یا موت یا دائمی فکر اور اللہ کے محبوب اعمال کی انجام دہی سے رک جانے کا سبب بن جائے تو یہ خوف قابل تعریف نہیں بلکہ قابلِ مذمت ہے۔ (التخویف من النار: ۱۸)

علامہ ابن القیم نے لکھا ہے کہ:

”سچا اور قابل تعریف خوف وہ ہے جو انسان اور محرمات الٰہیہ کے درمیان حائل ہوجائے، اگر خوف اس سے زائد ہوجائے تو اس میں مایوسی اور ناامیدی کا اندیشہ ہوتا ہے اس لئے وہ قابل مذمت ہے، ابوعثمان کے بقول ظاہری و باطنی گناہوں سے اجتناب ہی سچا خوف ہے، اور بقول امام ابن تیمیہ قابل تعریف خوف وہ ہے جو حرام امور سے روک دے اور بچالے“۔ (مدارج السالکین: ۱/۵۱۴)

امام غزالی نے خوف کی تین قسمیں کی ہیں: (۱) ناقص (۲) ضرورت سے زائد (۳) معتدل۔

خوف ناقص کی مثال عورتوں کی رقت ہے کہ وہ قرآن کی ایک آیت سن لیتی ہیں تو ان پر گریہ طاری ہوجاتا ہے اور اشک رواں ہوجاتے ہیں، اسی طرح خوفناک چیز دیکھ لیتی ہیں تو رونے لگتی ہیں، پھر اس کے بعد غفلت طاری ہوجاتی ہے، یہ خوف ناقص، بے فائدہ، بے نتیجہ اور بے اثر ہوتا ہے۔

اور ضرورت سے زائد خوف وہ ہے جو حد اعتدال سے تجاوز کر کے مایوسی کی حد میں داخل ہوجائے اور عملی قوت ختم اور کمزور کردے، معتدل خوف وہ ہوتا ہے جو اعضاء کو معاصی سے روکتا اور طاعات کا پابند کرتا ہے۔ (احیاء العلوم:۱۵۶/۴)

علماء کا کہنا ہے کہ رونے اور آنکھ سے اشک پونچھنے والا خائف نہیں ہے، خائف تو وہ ہے جو گناہوں کو اللہ کی سزا کے ڈر سے چھوڑ دے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو کسی چیز سے ڈرتا ہے وہ اس سے دور بھاگتا ہے اور جو اللہ سے ڈرتا ہے وہ اللہ کی طرف بھاگتا ہے، خوف الٰہی کی پہچان یہی ہے۔

امام غزالیؒ نے خوفِ خدا کی اہمیت کے ذیل میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ ''شہواتِ نفسانیہ کا قلع قمع کسی اور تدبیر سے اتنا ممکن نہیں جتنا خوفِ خداوندی کی تدبیر سے ممکن ہے، خوفِ خدا ہی شہوتِ نفس کو جلانے والی آگ اور ختم کرنے والا زہر ہے، خوف جس قدر زیادہ اور پختہ ہوگا شہوتیں اتنی ہی زیادہ ختم ہوں گی، معاصی سے اتنا ہی زیادہ بچاؤ ہوگا اور طاعات کا اتنا ہی زیادہ شوق اور اہتمام ہوگا، خوف کی اہمیت وعظمت تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں، کیونکہ عفت مآبی، خدا ترسی، ورع و پرہیزگاری اور مجاہدہ جیسے اللہ کا قرب عطا کرنے والے اعمال واوصاف صرف خوفِ خدا کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ (احیاء العلوم:۱۰۶/۴)

خوف خدا کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے آخرت میں دشواریوں سے بےخوفی اور امن حاصل رہے گا، ارشادِ نبوی ہے:

"اللہ فرماتا ہے کہ میری عزت وجلال کی قسم! میں اپنے کسی بندے کے لئے دوخوف یا دو امن جمع نہ کروں گا، اگر وہ دنیا میں مجھ سے بےخوف رہا تو قیامت میں میں اسے خوف میں مبتلا کردوں گا، اور اگر وہ دنیا میں مجھ سے ڈرتا رہا تو قیامت میں میں اسے بےخوف بنادوں گا"۔ (بزار)

قرآنِ کریم میں یہی بات بار بار کہی گئی ہے، مثلاً ارشاد ہے:

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ أَمِيْنٍ. (الدخان: ٥١)

ترجمہ: اہل تقویٰ امن کی جگہ میں ہوں گے۔

اہل جنت سے کہا جائے گا:

اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ آمِنِيْنَ. (الحجر: ٤٦)

ترجمہ: تم جنت میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہوجاؤ۔

ارشادِ باری ہے:

أَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ أَمَّنْ يَّأْتِيْ آمِناً يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

(حٰم السجدة: ٤٠)

ترجمہ: آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟

وَهُمْ مِنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ آمِنُوْنَ. (النمل: ٨٩)

ترجمہ: اور (اہل ایمان کامل) اس دن (قیامت میں) گھبراہٹ سے محفوظ ہوں گے۔ یعنی بےخوف ہوں گے۔

اگر انسان کا دل دنیا میں اللہ کے خوف سے لرزتا ہے تو اس خوف کا ثمرہ قیامت میں بےخوفی، امن اور جنت کی شکل میں ملے گا اور وہاں اہل جنت اپنا یہ حال بیان کریں گے کہ:

إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيٓ أَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ، فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ. (الطور: ۲۶-۲۷)

ترجمہ: ہم دنیا میں خائفانہ زندگی گزارتے تھے، اس کے ثمرے میں اللہ نے ہم پر فضل فرمایا ہے اور ہم کو آتشِ سوزاں کے عذاب سے محفوظ فرمایا ہے۔

اور اگر انسان کا دل دنیا میں اللہ سے اور آخرت کی باز پرس سے بےخوف ہے تو قیامت میں اس کا حال یہ ہوگا کہ وہ کانپ رہا ہوگا اور بالآخر لقمۂ جہنم بنے گا، روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک نوجوان کے پاس آئے جو نزع کے عالم میں تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کیا حال ہے؟ اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! متضاد کیفیت ہے، اپنے گناہوں کا خوف بھی ہے اور اللہ کی رحمت کی امید بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ:

لَا يَجْتَمِعَانِ فِيْ قَلْبِ عَبْدٍ فِيْ مِثْلِ هٰذَا الْمَوْطِنِ إِلَّآ أَعْطَاهُ اللّٰهُ مَا يَرْجُوْ، وَآمَنَهُ مِمَّا يَخَافُ. (ترمذی شریف)

ترجمہ: یہی ایمان ہے، جس بندۂ مؤمن کے دل میں اس جیسے (مشکل) موقع پر خوف ورجاء دونوں جمع ہوجاتے ہیں تو اللہ معاملہ یہ کرتا ہے کہ اسے اس کی امید کے مطابق اپنی رحمت سے نوازتا ہے اور اسے خوف سے امن میں لے آتا ہے۔

خداترسی

خوف خدا اور فکر آخرت وہ چیزیں ہیں جو ایمان کے بعد حیات انسانی کی اصلاح، آراستگی اور کامیابی میں سب سے اہم اور کلیدی رول ادا کرتی ہیں، اللہ کا خوف اور اس کے عذاب وعقاب اور گرفت سے ڈرنا ہی انسان کی نجات اور فلاح کی اساس ہے، ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب اللہ کے خوف سے کسی بندہ کے جسم کا رونگٹا کھڑا ہوجاتا ہے تو اس وقت اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے پرانے بوسیدہ درخت کے پتے جھڑتے ہیں، ایک دوسری حدیث میں اللہ کے خوف اور اس کی ہیبت سے آنکھوں کے اشکبار ہونے اور آنسوؤں کے ڈھلک کے رخسار پر آجانے پر نارِ جہنم کے حرام ہوجانے کی اہل ایمان کو بشارت دی گئی ہے، قرآن کریم میں بھی معیار فضیلت خداترسی ہی کو قرار دیا گیا ہے:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ. (الحجرات: ۱۳)

ترجمہ: تم میں سب سے معزز اللہ کی بارگاہ میں وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی ابن کعبؓ سے پوچھا ''تقویٰ کی حقیقت کیا ہے''؟ انہوں نے فرمایا: کیا کبھی آپ کا گزر خاردار راہوں سے ہوا ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: بارہا میرا گزر رہوا ہے، حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا: ایسے میں آپ نے کیا کیا؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: میں نے اس میں پوری کوشش صرف کرڈالی کہ کانٹوں سے الجھے بغیر سلامتی سے باہر نکل آؤں، اس پر حضرت ابیؓ نے فرمایا: بس یہی تقویٰ کی حقیقت ہے۔

تقویٰ یہی ہے کہ گناہوں سے اپنا دامن نہایت احتیاط اور ہوش مندی سے بچالیا جائے، قرآن کی مختلف آیات میں خدا ترسی کا حق ادا کرنے، حسب الامکان اللہ سے ڈرنے، ہمیشہ لرزاں وترساں رہنے، خود احتسابی، زندگی کی آخری سانس تک خوف خدا کو ملحوظ رکھنے، اوراحکام اسلام کوانجام دینے کا بار بار حکم دیا گیا ہے۔

اور پھر جن دلوں میں خوفِ خدا جاگزیں ہوجاتا ہے، ان کے لئے جنت، انعامات الٰہی، رضائے خداوندی کی بشارتیں ہیں، خداترسی کی برکتوں، ثمرات اورفوائد کا کوئی شمار نہیں، ایک فائدہ یہی ہے کہ منجانب اللہ آسمانی اور زمینی برکتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں، مشکلات ومصائب میں نجات کی راہ مل جاتی ہے، بے سان وگمان رزق عطا ہوجاتا ہے، ناامیدی میں امید کی کرن نمودار ہوتی ہے، مایوسی کے عالم میں خوش خبری ملتی ہے، حق وباطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت، قوت اور شان پیدا ہوجاتی ہے، اللہ کی اعانت وامداد ونصرت وحفاظت ہمہ وقت سایہ فگن رہتی ہے، دشمن کی گزند سے پناہ رہتی ہے، خطاؤں اورلغزشوں کے بدل کے طور پر اعمالِ حسنہ کی منجانب اللہ توفیق عطا ہوتی ہے، آخرت میں تمام گناہوں کی مغفرت کا وعدہ بھی ہے، اللہ کی معیت نصیب ہوتی ہے۔

خداترسوں کے نمایاں اوصاف وعلامات یہ ہوتی ہیں کہ وہ کامل الایمان ہوتے ہیں، تمام طاعات کی انجام دہی کرتے ہیں، وعدہ اورعہد وفا کرتے ہیں، صبر واستقلال کے جوہر سے آراستہ ہوتے ہیں، خوشی وناخوشی، تنگی وفراخی، کشاکش، وکشائش، بیماری وتندرستی، سفر وحضر، شب وروز، صبح وشام ہر موقع ومرحلہ پر وہ راست باز، عبادت گزار اور اطاعت شعار ہوتے ہیں، غصہ پی جاتے ہیں، تحمل سے کام لیتے ہیں، اپنی خطاؤں پر نادم وپشیمان اور بصدق قلب تائب ہوتے ہیں۔

خداترسی اورتقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہوتا ہے، خداترس وہی ہے جس کا دل اللہ

کے خوف سے لرزتا، تڑپتا اور دھڑکتا رہے اور اس دل کے لرزنے کا اثر ظاہری اعمال پر اس صورت میں نمایاں ہو کہ نیک اعمال ہی ہوں، اور سوءِ اتفاق خطائیں ہو بھی جائیں تو فوراً تنبہ اور آگاہی ہو اور توفیقِ توبہ ہو۔

خدا ترسی کی دولت سب سے قیمتی دولت ہے، جسے یہ دولت مل گئی اس کے لئے دنیا کی تمام چیزیں بے مایہ اور ہیچ ہو جاتی ہیں۔

دین پر جماؤ

احادیثِ نبویہ میں قربِ قیامت میں آنے اور چھانے والے فتنوں کی مکمل اور مفصل پیش گوئی ملتی ہے، اور یہ وضاحت ملتی ہے کہ فتنوں کے غلبے کے دور میں دین پر جماؤ اور شریعت پر استحکام کا ثواب دوسرے ادوار کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے، مشکل اور ناگفتہ بہ حالات میں جہاں ایمان اور عملِ صالح کی راہ میں خطرات اور روڑے ہوں، دشمنانِ دین اہل حق کی مذہبی آزادی کے لئے بالکل تیار نہ ہوں اور ہر ممکن کوشش سے حق کی راہِ مسدود کرنے کے دَرپےَ ہوں، ان حالات میں جو بندۂ خدا صراطِ مستقیم پر گامزن رہے اور اس کے قدم جادۂ حق پر استوار رہیں، اس کے دین کی قوت، یقین کی پختگی اور استقامت وثابت قدمی اللہ کی نگاہ میں بڑی قدرومنزلت رکھتی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ:

اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ وَأَحَبُّ إِلَی اللّٰہِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ.

(مسلم شریف)

ترجمہ: طاقتور مسلمان (ایمانی طاقت اور جسمانی قوت کا حامل) اللہ کی نگاہ میں کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور محبوب وپسندیدہ ہے۔

احادیث ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دورِ فتن میں دین پر جمے رہنے والے کو پچاس مسلمان کے برابر اجر ملتا ہے، ابوامیہ شعبانی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوثعلبہ خشنی سے پوچھا کہ اِس آیت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس میں اہل ایمان سے کہا گیا ہے:

عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ، لاَ يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ، إِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعاً. (المائدة: ١٠٥)

ترجمہ: اپنی فکر کرو، تم اگر ہدایت یافتہ ہو تو گمراہ لوگ تم کو بالکل نقصان نہ پہنچا سکیں گے، تم سب کو لوٹ کر اللہ کے پاس جانا ہے۔

حضرت ابو ثعلبہ نے فرمایا کہ میں نے اس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:

اِئْتَمِرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنَاهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ حَتّٰى إِذَا رَأَيْتَ شُحّاً مُطَاعاً وَهَوًى مُتَّبَعاً وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً، وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِيْ رَأْيٍ بِرَأْيِهٖ، فَعَلَيْكَ نَفْسَكَ، وَدَعْ أَمْرَ الْعَوَامِّ، فَإِنَّ وَرَاءَكُمْ أَيَّامَ الصَّبْرِ، فَمَنْ صَبَرَ فِيْهِنَّ قَبَضَ عَلَى الْجَمْرِ، لِلْعَامِلِ فِيْهِنَّ أَجْرُ خَمْسِيْنَ رَجُلاً يَعْمَلُوْنَ مِثْلَ عَمَلِهٖ. (ترمذی شریف: ٣٠٦٠، ابن ماجة: ٤٠٤١)

ترجمہ: تم نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو، یہاں تک کہ جب تم یہ دیکھ لو کہ بخل وحرص کی راہ پر لوگ چل رہے ہیں، خواہشِ نفس کی پیروی ہو رہی ہے، دنیائے دوں کو آخرت پر ترجیح دی جارہی ہے، ہر صاحب رائے اپنی رائے پر خوش (اور مصر ہو کر اسی کو حرفِ آخر قرار دینے پر تلا ہوا) ہے، اور فساد و بگاڑ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کا مقابلہ وازالہ اور روک تھام تمہارے بس سے باہر ہے تو پھر تم اپنی (اور اپنے ایمان کے بچاؤ کی) فکر میں لگ جاؤ، دوسروں کو ان کے حال پر چھوڑ دو (ان کے پیچھے مت پڑو) آگے چل کر (فتنوں اور شدائد کے) ایسے ایام آنے والے ہیں جن میں دین پر جماؤ انگارہ ہاتھ میں لینے کی طرح (مشکل اور مصائب سے پر) ہوگا، ان حالات میں دین اور عمل صالح پر قائم رہنے والے کو اس جیسا

عمل کرنے والے پچاس افراد کے ثواب کے برابر ثواب ملے گا۔

آج امت مسلمہ داخلی وخارجی فتنوں سے گھری ہوئی ہے، کفر کی قوتیں باہر سے، نفاق کی قوتیں اندر سے اور نفس کی شہوتیں دل کے اندرون سے پوری امت پر حملہ آور ہیں، مذکورہ حدیث میں امت کے لئے بہت کچھ سامانِ تسلی اور موجودہ صورتحال کا لائحۂ عمل موجود ہے، امت اگر اپنا ایمانی تحفظ چاہتی ہے تو اسے دین کی طرف لوٹنا ہوگا، یہ حدیث امت کے لئے بشارتِ عظمیٰ ہے جس میں وارد ہوا ہے:

عِبَادَةٌ فِي الْهَرَجِ كَهِجْرَةٍ إِلَيَّ. (مسلم شریف)

ترجمہ: فتنے کے زمانے میں اللہ کی (پرخلوص) عبادت میری (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی) طرف ہجرت کے (اجر وثواب میں) برابر ہے۔

انسان کی ناشکری

انسان پر خدائے ذوالجلال کی نعمتیں شمار سے باہر ہیں، اللہ نے انسان کو سب سے مکرم بنایا ہے، اسے بحر و بر میں سواریاں عطا کی ہیں، اسے پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا ہے، اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی ہے، خوبصورت سانچے اور بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے، اشرف المخلوقات بنایا ہے، اسے اس کائنات کا سب سے زیادہ قیمتی، قابل احترام، لائق محبت اور مستحق حفاظت وجود بنایا ہے، اسے اس بزمِ عالم کا صدر نشین بنایا ہے، اس کا رتبہ اتنا برتر کیا ہے کہ اس سے اوپر صرف خدا کی ہستی رہ جاتی ہے، قرآن کی زبان میں انسان اللہ کا نائب ہے، یہ پوری دنیا اور پورا کارخانۂ عالم اسی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، کائنات کی اشیاء کو اس کی خدمت میں لگا دیا گیا ہے، زمین و آسمان کی تمام چیزیں اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں، اللہ نے اپنی ظاہری و باطنی، عیاں و نہاں، کھلی چھپی تمام نعمتیں انسان پر تمام کر دی ہیں، سب اشیاء اس کی تابع و خادم بنائی گئی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی نعمتوں کو شمار ہی نہیں کر سکتا، اس کی نعمتوں کا بحر بے کراں ہے، اس کا کوئی ساحل و کنارہ ہی نہیں، ہر آن اس کی نعمت و فضل کی بارش انسان پر برستی رہتی ہے:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند
تا تو نانے بکف آری و غفلت نہ خوری

اللہ نے انسان کو اپنا کنبہ قرار دیا ہے، انسانیت کا حد درجہ احترام اللہ کی شریعت میں ملحوظ رکھا گیا ہے، ان تمام بے پایاں نعمتوں کا شکر اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب انسان اپنے

مقصدِ تخلیق یعنی عبادت و بندگی سے کسی لمحہ غافل نہ ہو، لیکن دوسری طرف اکثر انسانوں کی صورت حال بالکل الٹی ہے، قرآن کی زبان میں :

أَلَـمْ تَـرَ إِلَـى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْراً، وَّأَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ. (ابراهيم: ۲۸)

ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت پائی اور اسے کفرانِ نعمت سے بدل ڈالا اور اپنے ساتھ اپنی قوم کو بھی ہلاکت کے گھر میں جھونک دیا۔

ایک طرف اللہ نے ہر طرح کی نعمت دی اور:

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ، وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً، فَـأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ، وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِىَ فِى الْبَـحْـرِ بِـأَمْرِهٖ، وَسَـخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ، وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْـنِ، وَسَـخَّـرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ، وَآتَاكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوْهُ، وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا، إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ.

(ابراهيم: ۳۲-۳٤)

ترجمہ: آسمان وزمین کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسانی کے لئے طرح طرح کے پھل دیئے، اس نے کشتی کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لئے مسخر کیا، سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگا تار چلے جارہے ہیں اور رات و دن کو تمہارے لئے مسخر کیا اور تمہیں وہ سب کچھ دیا جو تم نے مانگا، اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے، حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے

انصاف اور ناشکرا ہے۔

فطرت کی ہر مانگ، زندگی کا ہر مطلوب اور بقاء وارتقاء کے تمام وسائل فراہم ومہیا کئے جانے کے باوجود یہ انسان ناشکری اور احسان فراموشی کی آخری حدوں تک پہونچ چکا ہے، انسان کا اپنا وجود ایک عالم اصغر ہے، اس کے تمام اعضاء، جسم کے ہر جوڑ اور ہر رگ وریشہ میں اللہ وحدہٗ لاشریک لہ کی لامتناہی نعمتوں کا ایک خزانہ مخفی و پنہاں ہے، لیکن انسانی طبیعت کی یہ عالمگیر کمزوری ہے کہ جب تک وہ ایک نعمت سے محروم نہیں ہوجاتا تب تک اس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتا اور ناشکری کرتا جاتا ہے، قرآن نے انسان کو اسی کفرانِ نعمت کی طرف بارہا متوجہ کیا ہے۔

نعمتوں کی ناقدری، کفرانِ نعمت، احسان ناشناسی، معصیت اور بے راہ روی کے نتائج انسان کو مصائب، مشکلات، حادثات اور اذیتوں کی شکلوں میں بھگتنے پڑتے ہیں، قرآن کہتا ہے:

وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً قَرْیَۃً کَانَتْ آمِنَۃً مُطْمَئِنَّۃً، یَّأْتِیْھَا رِزْقُھَا رَغَداً مِنْ کُلِّ مَکَانٍ، فَکَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰہِ، فَأَذَاقَھَا اللّٰہُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ. (النحل: ۱۱۲)

ترجمہ: اور دیکھو کہ اللہ نے ایک مثال بیان کی، ایک بستی تھی جہاں ہر طرح کا امن تھا، ہر جگہ سے سامانِ رزق آتا رہتا تھا اور ہر شخص فراغت سے کھاتا رہتا تھا، لیکن پھر ایسا ہوا کہ انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی تو اللہ نے بھی ان کے کاموں کی پاداش میں انہیں نعمتوں سے محروم کردیا، تنعم کی جگہ فاقہ اور امن کی جگہ خوف ان پر چھا گیا۔

دنیوی نتائجِ بد کے سوا اخروی نتائج کہیں زیادہ بدتر ہوں گے، قرآن کے بقول:

لَھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ، وَمِنْ تَحْتِھِمْ ظُلَلٌ، ذٰلِکَ

يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ، يَا عِبَادِ فَاتَّقُوْنِ. (الزمر: ۱٦)

ترجمہ: ان پرآگ کی چھتریاں اوپر سے بھی چھائی ہوں گی اور نیچے سے بھی، یہ وہ انجام ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، تو اے بندو! میرے غضب سے بچو۔

وجودِ انسانی پر یہ خدائی لامتناہی نعمتیں دعوتِ شکر وعمل دیتی ہیں، یہ بندوں کو خدا کا پیغام سناتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اللہ کا کرم اور فیض بالکل عام ہے، اس کی ہدایت سب کو یکساں ہے مگر اکثر افراد اس دعوت اور صدا پر ذرا بھی کان نہیں دَھرتے اور ناشکری وبے عملی میں مسلسل مبتلا رہتے ہیں جس کا خمیازہ نعمتوں سے محرومی کی شکل میں بھگتنا پڑتا ہے:ـــ

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں

کامل انسان اور مکمل انسانیت

قرآنِ کریم فرماتا ہے کہ:

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهُ بِالْخَيْرِ، وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولاً.

(بنی اسرائیل: ۱۱)

ترجمہ: انسان شر اسی طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہیئے، انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔

وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُوراً. (بنی اسرائیل: ٦٧)

ترجمہ: انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔

وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَتُوراً. (بنی اسرائیل: ۱۰۰)

ترجمہ: واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔

وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلاً. (الکہف: ٥٤)

ترجمہ: انسان بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔

قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ. (عبس: ۱۷)

ترجمہ: خدا کی مار ہو انسان پر کیسا ناشکرا اور منکرِ حق ہے وہ۔

يٰأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ الَّذِي خَلَقَكَ.

(الانفطار: ٦)

ترجمہ: اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے اس ربِ کریم کی طرف سے دھوکے میں ڈال دیا ہے جس نے تجھے پیدا کیا۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغٰى، أَنْ رَّآهُ اسْتَغْنٰى، إِنَّ إِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى.

(العلق: ٦-٨)

ترجمہ: انسان سرکشی کرتا ہے اس بناء پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے حالانکہ پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ. (العاديات: ٦)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔

يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهٗ أَخْلَدَهٗ. (الهمزة: ٣)

ترجمہ: انسان سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس سدا رہے گا۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا، وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا، إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ.

(المعارج: ١٩-٢٣)

ترجمہ: انسان کم ہمت، تھڑدلا، بے صبرا پیدا کیا گیا ہے جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے مگر وہ نمازی جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں۔

وَإِنَّا إِذَا أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً، فَرِحَ بِهَا، وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيْهِمْ فَإِنَّ الْإِنْسَانَ كَفُوْرٌ. (الشوریٰ: ٤٨)

ترجمہ: انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو اس پر پھول جاتا ہے اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اس پر الٹ پڑتا ہے تو وہ سخت ناشکرا بن جاتا ہے۔

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهٗ فَأَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْ

أَكْرَمَنْ وَأَمَّا اِذَا مَا ابْتَلاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُوْلُ رَبِّیْ أَهَانَنْ.

(الفجر: ١٥-١٦)

ترجمہ: مگر انسان کا حال یہ ہے کہ اس کا رب جب اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت اور نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنادیا اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔

وَإِذَآ أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَ بِجَانِبِهٖ، وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ. (حٰمٓ السجدة: ٥١)

ترجمہ: انسان کو جب ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ منھ پھیرتا ہے اور اکڑ جاتا ہے، اور جب اسے کوئی آفت چھوجاتی ہے تو لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔

خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيْفاً. (النساء: ٢٨)

ترجمہ: انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهٖ أَوْ قَاعِداً أَوْ قَائِماً، فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَأَنْ لَّمْ يَدْعُنَا إِلٰى ضُرٍّ مَسَّهٗ. (یونس: ١٢)

ترجمہ: اور جب انسان پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو وہ کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہم کو پکارتا ہے، مگر جب ہم اس کی مصیبت ٹال دیتے ہیں تو ایسا چل نکلتا ہے کہ گویا اس نے کبھی اپنے کسی برے وقت میں ہم کو پکارا ہی نہ تھا۔

قرآن نے مختلف مقامات پر انسان کے طرزِ عمل اور نفسیات کا یہ نقشہ بھی کھینچا ہے: لیکن یہ اوصاف عام طور پر انسان کی اس نوع کے ہیں جو جو ہر ایمان سے محروم ہو یا ایمان کے رسمی اظہار کے بعد اپنی پوری زندگی خلافِ ایمان اعمال میں بسر کرتی ہو، جو انسان ایمان

اور عمل صالح کے ذریعہ اپنی انسانیت کو آراستہ اور درست نہ کرتا ہو وہ ہر طرح کی برائیوں میں ملوث ہوتا ہے اور وہ قرآنی تعبیر کے مطابق جانور بلکہ اس سے بھی زیادہ گیا گذرا ہوتا ہے، جو انسان ننگ انسانیت ہو تو وہ کتے اور گدھے سے بھی زیادہ بے حیثیت ہوتا ہے، پھر نہ دنیا اس کی ہے اور نہ آخرت۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے:

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ، إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (العصر)

ترجمہ: زمانے کی قسم! انسان درحقیقت خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔

انسان صحیح معنوں میں وہ ہے جو اپنا مقصدِ تخلیق ہر لمحہ پیش نظر رکھ کر اسی میں لگا رہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کا ہر قدم جادۂ مستقیم پر استوار رہے، ایسے ہی انسان کو خساروں اور ہلاکتوں سے بری قرار دیا گیا ہے، لیکن وہ انسان جو ناشکری، بے صبری، انکارِ حق، کم ہمتی، جھگڑے، سرکشی، عناد، مادّیت، زر پرستی، اتباعِ ہویٰ، بخل، اکڑ، کبر، احسان فراموشی، محسن کشی اور غدر وخیانت جیسی تمام لعنتوں میں اسیر ہو اور جو اپنی خساست ودناءت کی وجہ سے مذہب، قوم، وطن سب کے لئے ننگ وعار بن چکا ہو وہ صحیح معنوں میں انسان کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

کیا عقل سلیم اس کی روادار ہوسکتی ہے کہ اسے انسانوں کے زمرہ میں شامل کیا جائے جو اپنے بھائیوں کو بھی اپنی سفا کی اور وحشیت کا نشانہ بناتا ہو، جو ہزاروں معصوموں کی جانیں لے کر ان کے تڑپتے لاشوں پر ہنستا اور ٹھوکریں مار کر گذر جاتا ہو، جو معصوم بچوں کے منہ سے نوالے چھین کر ان کے تڑپنے کا منظر دیکھتا اور خوش ہوتا ہو، اور جو بچوں کو یتیم، خواتین کو بیوہ اور ماؤں کو لاولد کر کے چین پاتا اور رقص کرتا ہو، جو امانت ودیانت اور عہد ووعدہ کی پاسداری

سے بالکل نا آشنا ہو، جو اپنے منافع کے لئے دوسروں کے ہر نقصان کو انگیز کرتا ہو اور جو اپنے خسیس مقاصد کی تکمیل کے لئے ہر حد تجاوز Cross کرنے میں کوئی باک نہ رکھتا ہو؟

موجودہ دنیا میں ان نام نہاد انسانوں کی کثرت ہے جو اپنے اعمال واوصاف میں شیاطین سے مشابہ ہیں، کوئی دین کے نام پر دنیا طلبی میں لگا ہوا ہے، کوئی وطن پرستی کے نام پر وطن فروشی کرر ہا ہے، کوئی تجارت کا سہارا لے کر چوری کرر ہا ہے، کوئی محبت کا دَم بھر کر چھری چلا رہا ہے، کوئی معلم بن کر تعلیم کے اعلیٰ اقدار کو ملیا میٹ کرر ہا ہے، کوئی ڈاکٹر بن کر خدمتِ خلق کے نام پر لوٹ مار کرر ہا ہے، کوئی اپنی بیوی سے خیانت کرر ہا ہے، کوئی اپنے شوہر کی آنکھوں میں دھول جھونک کر خفیہ آشنائی میں مصروف ہے۔ بدکرداری کے بے شمار نمونے اور لامتناہی فہرست ہے، ہر ایک دوسرے کو کھانے اور ڈسنے کے چکر میں ہے، انسان اب ایسا بھیڑیا بن گیا ہے جس سے جنگل کے بھیڑیئے شرماتے ہیں۔

نئی تہذیب وتمدن کے علمبرداروں میں یہ بدکرداری کچھ زیادہ ہی نمایاں ہے، اور ہر صاحب بصیرت انسان ایک لمحہ میں اس کا اندازہ کرلیتا ہے، حکیم مشرق اقبال کا بیان ہے کہ میخانۂ مغرب میں ان کو دردِ سر کے سوا کچھ نہ ملا اور دانشمندانِ فرنگ کی ہمراہی میں گذرے ہوئے دن سے زیادہ بے کیف، بے سوز اور بے نور شب وروز ان کی پوری زندگی میں کبھی نہیں آئے: ؎

مَے از مَے خانۂ مغرب چشیدم
بجانِ من کہ دردِ سر خریدم
نشستم با نکویانِ فرنگی
ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

قرآن کے بیان کے مطابق جب انسان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کی عبادت اور بندگی ہے تو پھر ایمان وعبادت سے انحراف رکھنے والا ہر عمل انسان کو اس کے مقصدِ حیات سے غافل اور دور کرتا چلا جائے گا، اور مقصد سے منحرف انسان کیسے صحیح معنوں میں انسان کہلا سکتا ہے؟

اِس مقصد سے دوری کے بعد انسان خواہ کوئی بھی عمل کرلے، کوئی بھی ایجاد کرلے، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرلے یا چاند پر ٹھکانہ کرلے مگر وہ ہر آن انسانیت سے دور ہوتا جائے گا، نہ وہ اپنے خدا سے قریب ہوسکے گا، نہ وہ اپنی زندگی کی شب تاریک کو سحر کرسکے گا اور نہ وہ کسی کامیابی سے ہم کنار ہوسکے گا۔

مقصد حیات سے دوری اور اللہ سے قطع تعلق کی صورت میں انسان اس وقت کائنات کی سب سے بدترین مخلوق رہتا ہے، اور آخرت میں بھی وہ سب سے زیادہ رسوا ہوگا۔

اور مقصد حیات پر مضبوطی سے جماؤ اور اللہ سے تعلق کے نتیجہ میں انسان اس کائنات کی اشرف ترین مخلوق ہوتا ہے اور آخرت کی ساری نعمتوں سے بھی سب سے زیادہ وہی بہرہ مند ہوگا۔

مقصد حیات پر جماؤ اسی صورت میں پیدا ہوگا جب ان اوصاف کا مصداق بننے سے اپنے کو بچایا جائے جو قرآن کے حوالہ سے آغاز میں ذکر کئے گئے، ہماری مشکل یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات سے ہمارا عمل بالکل مختلف ہے اور یہی دین ودنیا میں ہماری پسماندگی کا سبب ہے، اقبال کے بقول مسلمانوں کے دلوں میں اب زندگی کا شرارہ گل ہورہا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق ختم ہوچکا ہے:ـ

در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست
مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست

اور اس افسوسناک صورتحال کا خاتمہ مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں، ناامیدی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ہاں شرط یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت کے مطابق ایمان، عمل صالح، صبر وحق کی تلقین کے وہ اوصاف اختیار کرلئے جائیں جو ہر خسارہ سے نجات کے ضامن ہیں ـ

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

تصنع واسراف اور سادگی

تاریخ کی کتابوں میں وزیر ''ابن الفرات'' کے بارے میں یہ ملتا ہے کہ اسراف اور عیش پرستی میں وہ اتنا زیادہ ڈوب گیا تھا کہ اس کے کھانے کے وقت دستر خوان پر تیس سے زائد چمچے سونے کے رکھے جاتے تھے اور وہ ایک چمچہ سے ایک لقمہ سے زیادہ نہ کھاتا تھا، ہر لقمہ پر چمچہ بدلتا تھا۔

عباسی خلیفہ مامون الرشید کے بارے میں آتا ہے کہ بسا اوقات اس کے دستر خوان پر تین سو سے زائد کھانے کی اقسام وانواع ہوتی تھیں وہ سب کو چکھتا تھا، دستر خوان لگانے اور اٹھانے پر دسیوں ملازم مامور تھے۔

خلیفۂ عباسی مقتدر باللہ کی والدہ کا یہ واقعہ تو تاریخ میں مذکور ہے کہ اس کا جوتا بے حد قیمتی کپڑوں سے بنایا جاتا تھا، وہ کپڑے پہلے سائز کے حساب سے کاٹ لئے جاتے تھے پھر انہیں مشک وعنبر میں ملایا جاتا تھا اور پھر جوتا بنایا جاتا تھا، اور یہ قیمتی جوتا وہ چند روز استعمال کر کے ملازماؤں کو دے دیا کرتی تھی۔

ہارون رشید ایک بار ابراہیم بن مہدی کے ہاں دعوت پر گیا، دستر خوان پر ایک برتن میں مچھلیوں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آئے، ہارون نے پوچھا کہ باورچی نے ٹکڑے اتنے چھوٹے کیوں کر دیئے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا: امیر المؤمنین! یہ مچھلیوں کی زبانیں ہیں، ہارون نے قیمت پوچھی تو وہ ہزاروں درہم سے متجاوز تھی، اس پر ہارون نے ہاتھ کھینچ لیا اور کچھ نہ کھایا۔

خلیفہ معتضد کے پاس ۹ رملین دینار تھے اس نے یہ آرزو کی تھی کہ ایک ملین اور مل جائیں تو کل دس ملین ہو جائیں اور پھر وہ ان سب کو یکجا کر کے کسی خاص جگہ نمائش کے لئے رکھ دے تاکہ دنیا میں یہ مشہور ہو جائے کہ معتضد کے پاس دس ملین دینار ایسے ہیں جن کی اسے چنداں ضرورت نہیں ہے، لیکن: ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آرزو پوری ہونے سے قبل پیغامِ اجل آ پہنچا۔

اسراف و تعیش کے یہ اور اس جیسے سیکڑوں واقعات کتبِ تاریخ میں موجود ہیں، ہر دور میں اسراف و تصنع کی شکلیں بدلتی رہی ہیں، نئی تہذیب میں اس کی بے شمار جدید شکلیں سامنے آئی ہیں، اور زمانۂ قدیم اور موجودہ دور میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں اسراف و تعیش صرف طبقۂ امراء کے بعض افراد تک محدود تھا، متوسط و ادنیٰ طبقے مکمل اس سے دور تھے، اور دوری کو بہتر سمجھتے تھے، لیکن دورِ حاضر میں اب یہ وباء اعلیٰ اور متوسط دونوں طبقوں میں سرایت کر چکی ہے، ایک شادی ہی کا مسئلہ ہے جس کی مہینوں پہلے سے تیاریاں ہوتی ہیں، پانی کی طرح پیسے بہائے جاتے ہیں، رقم خرچ کرنے کے نِت نئے راستے نکالے جاتے ہیں، اور پورا خاندان اس اسراف کی وجہ سے ناقابل بیان بوجھ کے نیچے دبا رہتا ہے۔

اسی تصنع و تعیش نے پورے نظامِ زندگی کو پیچیدہ بنا ڈالا ہے، ماڈرن اور ایڈوانس اور اپ ٹو ڈیٹ کھلانے کے شوق اور ''اپر کلاس'' میں شامل ہونے کی حرص کچھ اتنی بڑھ چکی ہے اور مادّیت کی چمک اس درجہ خیرہ کر چکی ہے کہ دل نہ چاہتے ہوئے تصنع اور دکھاوے کے لئے انسان اسراف و تعیش کی آخری حدوں تک جا پہونچنے کے لئے ہر طرح سے کوشاں ہے، اس صورتحال نے نہ جانے کتنے گھروں اور خاندانوں کا گھریلو اور خاندانی نظام خراب کر ڈالا ہے، کمالیات (غیر ضروری چیزوں) کی طرف تصنع کے طور پر مکمل توجہ عام ہو چکی ہے، گھر کی ضرور

یات پوری ہوں یا نہ ہوں مگر لباس بالکل اعلیٰ ہو، سامان آرائش اعلیٰ ہو، یہ سوچ کی تبدیلی فی الواقع عقلی نابالغی کی دَین ہے، تصنع وتکلف کی یہی صورتحال ہر جگہ ہے، سرکاری ملازمت، تجارت، تقریبات، تعزیت وتہنیت ہر جگہ یہی تصنع اور دکھاوا ہے، کہیں بھی سادگی اور بے تکلفی نہیں ہے، اوراب تو ادب ولٹریچر میں بھی اس تصنع کا دور دورہ ہے، کوئی شعبہ اس سے محفوظ نہیں رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہورہا ہے فطرت سے بغاوت اور اس کی مخالفت ہے، فطرت سادگی پسند ہوتی ہے، وہ یہ چاہتی ہے کہ صاف، بے لاگ اور دوٹوک گفتگو ہو، سوچ صاف ستھری ہو، ظاہر کی آرائش میں اعتدال ہو، ذہن ودماغ کبر اور بڑکپن کی سوچ سے دور رہیں، سادگی میں اصل لذت ہے، اس میں دلی راحت بھی ہے اور جسمانی صحت بھی، اسراف سے دوری بھی ہے اور اس بات کا مکمل شعور بھی کہ مادّی زندگی ہی سب کچھ نہیں کہ اس کے پیچھے جی جان سے لگ جایا جائے، بلکہ روحانی خوبصورت زندگی بھی اس کی اولین مستحق ہے کہ اس پر توجہ دی جائے، اس کو وقت دیا جائے اور اس کو سنوارا اور سجایا جائے۔

مادّیت وروحانیت کے مابین توازن کے اسی فقدان نے انسان کو بگاڑ کی آخری سرحد پر لے جاکر کھڑا کردیا ہے، اور اس بگاڑ کو دور اسی طرح کیا جاسکتا ہے کہ یہ توازن پیدا کیا جائے اور روحانیت کو اولین درجہ دیا جائے اور مادّیت کو بقدرِ ضرورت اختیار کرنے کا ذہن بنایا جائے، یہی مسئلہ کا حل بھی ہے اور بگاڑ سے نجات کا ذریعہ بھی۔

ایک بڑا فتنہ

قیامت کی علامات اور قرب قیامت کے موقعے پر پیش آنے والے فتنوں کے ذیل میں اس کا ذکر احادیث میں جگہ جگہ ملتا ہے کہ آخری دور میں علم پھیل جائے گا، ذرائع علم بہت ہو جائیں گے، علم پر فخر اور اکڑ کا سلسلہ بڑھ جائے گا مگر علم کی حقیقی روح وغایت عمل کم اور ختم ہوتی چلی جائے گی۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ:

''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ علم جہل اور جہل علم نہ بن جائے''۔ (مصنف ابن ابی شیبہ)

اس روایت کا مصداق ہمارے اس دور میں پوری طرح سامنے آچکا ہے، صورتحال یہ ہے کہ اکثر افراد علم دین وشریعت سے بیزار اور دور ہیں، اور دینی علوم کے حصول وتحصیل سے گریزاں اور نفور ہیں، اور غیر دینی عصری علوم، کتب ومجلّات، غیر مفید مضامین وامور کے مطالعہ وتحصیل میں منہمک ہیں، اسی طرح اصل مقصود علم سے جہالت ہے، اور غیر مفید وغیر مقصود سے واقفیت کی طلب ہے جسے حقیقی معنوں میں علم کے بجائے جہالت سے تعبیر کرنا چاہیے۔

حضرت ضحاک سے مروی ہے کہ:

''ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں باتیں بہت ہوں گی لیکن قرآن سے دوری ہوگی، قرآن پر گرد وغبار ہوگا، لوگ اس کو نہ دیکھیں گے''۔ (زوائد الزہد)

یہ حدیث حکماً مرفوع ہے، ایسی پیشین گوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی کی

جاسکتی ہے۔ ہمارے موجودہ دور کی صورتحال یہی ہے کہ اخبارات، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے خبریں اور باتیں بہت بڑھ گئی ہیں، عصری کتابوں کی بھی یہی حالت ہے، اور ان کی طرف رجحان عام ہے، اور اس کے بالمقابل قرآن وسنت اور علوم دین سے اعراض، غفلت اور دوری کا سلسلہ جاری ہے، حدیث میں جس زمانہ کا ذکر ہے، قرائن بتارہے ہیں کہ اس وقت ہم اسی زمانے میں ہیں۔

حضرت علیؓ نے ایک بار فرمایا:

''اے حاملین علم! علم پر عمل کرو، عالم وہی ہے جو علم کے مطابق عمل کرے، اس کا عمل اس کے علم کے موافق ہو، عنقریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ علم حاصل کریں گے مگر علم ان کے گلوں سے آگے بڑھ کر دلوں میں نہ اتر پائے گا، ان کا عمل ان کے علم کے خلاف ہوگا، ان کا باطن ظاہر سے مختلف ہوگا، وہ حلقے لگا کر بیٹھیں گے اور ایک دوسرے پر فخر وتکبر کریں گے، اپنے ہم نشین کو دوسرے کے حلقہ میں بیٹھنے سے روکیں گے، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں مستحق قبول نہ ہوں گے''۔ (دارمی)

حضرت کعب احبار فرماتے ہیں:

''وہ زمانہ آنے کو ہے کہ لوگ عمل نہ کرنے کے لئے علم حاصل کریں گے، عبادت نہ کرنے کی نیت سے تفقہ حاصل کرنا چاہیں گے، آخرت کے عمل سے دنیا کمانا چاہیں گے، ان کے دل ایلوے سے زیادہ تلخ ہوں گے (یعنی کج ہوں گے) اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زبردست فتنے میں مبتلا کیا جائے گا''۔ (دارمی)

ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اس ماحول میں سب سے بہتر وہ شخص ہوگا جو قرآن کو مضبوطی سے تھامے رہے گا، حضرت سفیان ثوری کے بارے میں آتا ہے کہ وہ نبطیوں

اور گھٹیا لوگوں کو حدیث نہیں بتاتے تھے، اور فرماتے تھے کہ علم عرب سے لیا گیا ہے جب ان نبطی اور رذیل افراد تک علم پہونچ جائے گا تو یہ علم کو بدل دیں گے۔ (الحلیۃ لابی نعیم)

ہمارے زمانے میں کتب کی بآسانی فراہمی وغیرہ ذرائع کے ذریعے علم عام ہو چکا ہے اور رذیل وبدنیت افراد اس میں من چاہی تبدیلی کر رہے ہیں اور اپنے باطل نظریات کی تائید کے لئے غلط استدلال وتاویل کر رہے ہیں۔

فرمانِ نبوت کے مطابق ہر آنے والا زمانہ سابقہ زمانے سے بدتر اور خطرناک ہوتا جائے گا، آج جو حالات ہیں کل اس سے بھی زیادہ ہولناک حالات سامنے آئیں گے، علمی میدان میں آئے دن انکشافات اور ترقیاں ہوتی جارہی ہیں، سائنس دن بدن اپنا دائرہ بڑھاتی جارہی ہے، زمین کے ہر گوشہ میں اور فضاؤں میں ریسرچ ہورہی ہیں، خلائی تجربات ہورہے ہیں، لیکن ان کا کوئی فائدہ عملی میدان میں ظاہر نہیں ہورہا ہے، اخلاق وانسانیت کو دفن کیا جارہا ہے، حقیقی مطلوب علم اور اس پر عمل سے غفلت ہے اور غیر مقصود امور کی طرف مکمل توجہ اور انہماک ہے۔

اور جن کے پاس علم دین ہے بھی ان میں اکثریت کے پیش نظر حصول دنیا ہے، رضائے الٰہی، آخرت کی نعمتوں سے سرفرازی اور اخلاص کا جذبہ نایاب ہو چکا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ:

”ساٹھ سال کے بعد ایسے ناخلف جانشین آئیں گے جو نماز کو ضائع کریں گے اور خواہشِ نفس کی پیروی کریں گے اور گمراہ ہو جائیں گے، پھر ایسے جانشین آئیں گے جو قرآن پڑھیں گے مگر قرآن ان کے گلوں سے آگے ان کے دلوں میں نہ اترے گا، قرآن پڑھنے والے تین طرح کے افراد ہوں گے، مؤمن، منافق، فاجر وفاسق، مؤمن تو ایمان رکھے گا، منافق انکار کرے گا اور فاسق قرآن

سے دنیا کمائے گا‘‘۔ (مسند احمد)

ایسے ماحول میں کامیاب وہی ہوگا جو مضبوطی سے دین پر عمل پیرا ہو، کتاب وسنت کو حرزِ جاں بنائے رہے، مستقل شیطانِ مردود سے اللہ کی پناہ کا طالب رہے، دنیا کی لذتوں کو مطلق اہمیت نہ دے، علم دین حاصل کرے اور اس پر صحیح عمل کرے، فتنوں میں نجات کا یہی راستہ ہے۔

فوری طور پر ہمارے کرنے کے کام

یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اسلام اور اہل اسلام کے دینی ودنیوی استحکام، بقاء دوام اور قوت وشوکت کا اصل منبع اور سرچشمہ ایمانِ کامل، عمل صالح، رسوخِ دینی، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دعوتِ حق، اصلاحِ خلق کی سرگرمیاں ہیں، امت محمدیہ کا یہ خاص امتیاز اور مقصد حیات ہے، جسے قرآن یوں بیان کرتا ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ، تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (آل عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اسی مقصد کا ذکر مزید یوں ہوا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ. (آل عمران: ۱۰٤)

ترجمہ: تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔

نیز فرمایا گیا کہ:

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ. (الاعراف: ۱۸۱)

ترجمہ: ہماری مخلوق میں ایک امت ایسی بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتی ہے عدل وانصاف سے کام لیتی ہے۔

امتِ مسلمہ جب تک اپنے اس مقصد حیات کو انجام دیتی رہی اور اپنے امتیاز پر قائم ودائم رہی اس کے وجود کی برکات وثمرات سے عالم مستفید ہوتا رہا، لیکن پھر دینی غفلت اور بے حسی کے دَر آنے کی وجہ سے دعوتِ اسلام ونشر دین کا کام سست پڑ گیا، اسلام اور اس کی تعلیمات تو جوں کی توں باقی ہیں، وہ زندۂ جاوید اور فنا نا آشنا ہیں، مگر اہل اسلام کی عملی وفکری قوتوں اور احساسات وجذبات میں تبدیلی پیدا ہوگئی ہے، اب مسئلہ کا حل صرف عملی قوتوں کی بیداری میں منحصر ہے، اشاعت دین کی راہ اسی وقت ہموار ہوگی جب اس کے لئے اخلاص سے کام شروع کیا جائے گا۔

اور اس کام کی تاثیر مکمل طور سے اسی وقت سامنے آسکے گی جب مساواتِ اسلامی کا تصور عام اور ذات پات کا طبقاتی اختلاف ختم کر دیا جائے گا، طبقاتی اونچ نیچ کا تصور دعوتی راہ کا سب سے بڑا مانع ہے، ماضی میں غلبہ واشاعتِ اسلام میں اسلام کے تصور مساوات کا بنیادی رول رہا ہے، دوسری چیز ہے اخوت واتحاد، جب تک ہر کلمہ گو دوسرے کلمہ گو کے لئے اپنے دل میں محبت کے جذبات نہیں رکھے گا اور جب تک مسلم معاشرہ اخوت واتحاد کا نمونہ نہیں بنے گا غیروں میں دعوتی کام مؤثر نہ ہو سکے گا۔

تیسری چیز ہے لوگوں کی دینی واخلاقی اصلاح اور سدھار، کم سے کم مسلمانوں کی ظاہری زندگی اتنی پر کشش بنادی جائے کہ غیر مسلم اسلام سے وابستہ ہوں، نمازوں کا اہتمام، ارکان کی پابندی، شرکیہ امور ورسوم، بدعات وخرافات، محرمات ومنہیات، اخلاقی جرائم، خیانت وبدعہدی، جھوٹ وغیرہ سے مکمل دوری وبیزاری کی فضا عام ہوگی تو غیر مسلم اسلام کی طرف کشاں کشاں آئیں گے اور اسلام وحاملین اسلام کی عظمت ان کے دلوں میں جاگزیں ہوگی۔

اس سلسلہ میں دینی وشرعی مسائل واحکام کی تلقین وتعلیم اور دعوتی وتبلیغی امور میں شرکت کی دعوت وترغیب بھی کافی مؤثر کردار ادا کرسکتی ہے، جمعہ کے خطبات، خاص پروگراموں اور مجالس کے ذریعہ، مضامین ومقالات، کتابچوں، رسائل اور پمفلٹ کی مدد سے یہ کام ہوسکتا ہے۔

دوسری طرف یہ پیش نظر رہے کہ ہماری جہالت اور غربت اور سادہ لوحی وکوتاہ اندیشی بھی ہمارے زوال وضعف کے اہم اسباب ہیں، تعلیم کو عام کرنے، غربت کو دور کرنے کی کوشش میں لگنے، اور دور اندیشی پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے، اس کے لئے مکاتب ومدارس کا قیام، درسگاہوں کا انتظام، مشنری اسکولس کا بائیکاٹ، تجارتی جہد پیہم وغیرہ کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔

مال واولاد کا فتنہ

انسان کو اللہ کی جانب سے مال، اولاد اور دوسری چیزوں کی شکل میں جو نعمتیں ملتی ہیں وہ سب آزمائش ہیں۔قرآن اس حقیقت کو واضح کرتا ہے:

فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا، قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ، بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. (الزمر: ۴۹)

ترجمہ: جب انسان کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو وہ ہم کو پکارتا ہے پھر جب ہم اسے اپنی طرف سے نعمت عطا کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میرے علم کی بنیاد پر عطا کی گئی ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ نعمت (انسان کے شکر یا کفرانِ نعمت کی) آزمائش (ہوتی) ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

مزید ارشاد ہے:

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ. (التغابن: ۱۵)

ترجمہ: تمہارے مال اور اولاد آزمائش ہیں۔

جو بسا اوقات انسان کی آخرت کو اپنی دنیا بنانے کے لئے داؤں پر لگادیتے ہیں، ان سے مجبور ہو کر بسا اوقات آدمی حرام کا مرتکب ہو جاتا ہے، اللہ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہ ہو جاتا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، اسی درمیان حضرت حسن وحسین سرخ لباس پہنے ہوئے آگئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو

اٹھا کر گود میں بٹھالیا پھر فرمایا کہ قرآن بالکل سچ کہتا ہے کہ اموال واولاد آزمائش ہیں، دیکھو میں نے ان بچوں کو دیکھا تو مجھے صبر نہ آیا، میں نے خطبہ چھوڑ کر ان کو گود میں لے لیا، یہ بھی آزمائش ہے۔ (ترمذی شریف)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ کسی کو یہ دعا نہیں کرنی چاہئے کہ اے اللہ مجھے فتنہ سے بچائیے، کیونکہ اموال واولاد اور دیگر نعمتیں بھی فتنہ ہیں، ان سے محرومی کی دعا نامناسب ہے، دعا میں یہ کہنا چاہئے کہ:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ مُضِلَّاتِ الْفِتَنِ.

ترجمہ: اے اللہ میں فتنوں کے ذریعہ مبتلائے ضلالت ہونے سے پناہ چاہتا ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فتح مکہ کا ارادہ فرمایا اور اپنے قریبی صحابہ سے مشورہ کیا اور اس معاملہ کی راز داری کا حکم دیا، مگر مکے سے آئی ہوئی ایک مغنیہ خاتون کے ہاتھوں رؤساء قریش کے نام ایک مکتوب میں حضرت حاطب بن بلتعہؓ نے اس راز کو فاش کرنے کی کوشش کی، وحیِ الٰہی کی بنیاد پر اس خاتون کے مکہ پہنچنے سے قبل ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر مامور صحابہ نے وہ خط حاصل کرلیا اور راز فاش نہ ہوسکا، مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ نے حضرت حاطبؓ سے تحقیق چاہی، انہوں نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے معاملے میں جلدی نہ کیجئے، میں نے اس راز کو فاش کرنے کی کوشش کفر وارتداد کی وجہ سے نہیں کی ہے، نہ میں کفر کو پسند کرتا ہوں، الحمدللہ میرا ایمان مضبوط ہے، مجھے یقین تھا کہ یہ راز فاش ہو بھی جائے تب بھی فتح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گی، بس بات اتنی تھی کہ میرے بال بچے اور قرابت دار مکے میں ہیں، میں یہ راز فاش کر کے قریش پر احسان کرنا اور اس کے بدلے اپنے قرابت داروں کا تحفظ چاہتا تھا، بس یہی مقصد تھا، اس پر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عذر قبول کرلیا، اس واقعہ سے اولاد وا قارب کا فتنہ سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک بدری مشہور صحابی سے اولاد وا قارب کی محبت میں آکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا راز فاش کرنے کی کوشش کا اقدام سرزد ہوگیا۔

قرآن میں مختلف مواقع پر یہ تاکید آئی ہے کہ مال واولاد میں اتنا انہماک کی اللہ کی اطاعت اور ذکر سے غفلت ہوجائے ممنوع ہے۔ فرمایا گیا:

یٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِکُمْ أَمْوَالُکُمْ وَلَا أَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ، وَمَنْ یَفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ. (المنافقون: ۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے مال واولاد تم کو اللہ کے ذکر سے غافل نہ کریں، جو ایسا کرے گا (مال واولاد کی محبت میں اللہ کے ذکر سے غافل ہوگا) ایسے ہی لوگ خسارے میں رہیں گے۔

مزید ارشاد ہے:

یٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِکُمْ وَأَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ. (التغابن: ١٤)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہاری دشمنِ آخرت ہوتی ہیں تو ان سے محتاط رہا کرو۔

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شیطان انسان کے ایمان کی راہ میں بیٹھ کر اسے گمراہ کرنا چاہتا ہے، کہتا ہے کہ کیا اپنے آباء کا دین چھوڑ کر ایمان اختیار کرلوگے؟ مگر بندہ ایمان لے آتا ہے پھر ہجرت کا موقعہ آتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ کیا تم اپنے بال بچوں اور وطن کو چھوڑ دوگے؟ مگر بندہ ہجرت کر جاتا ہے، پھر جہاد کا موقعہ آتا ہے تو شیطان کہتا

ہے کہ کیا تم جان دے دو گے مگر بندہ جہاد پر جاتا ہے اور شہید ہوتا ہے، اللہ پر حق
ہے کہ اللہ اسے جنت میں داخل کر لے گا۔ (بخاری شریف)

قرآن وحدیث میں بے شمار نصوص ہیں جن میں اموال واولاد کے فتنے سے محتاط رہنے کی تلقین کی گئی ہے، عموماً گناہ اسی بے احتیاطی سے ہوتے ہیں، اس لئے بہت چوکنا وہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر

موروثی، نسلی، خاندانی اور ماحولیاتی اثرات کے وجود کے تمام تر اعتراف واقرار کے باوجود یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ہر انسان اپنی زندگی کو خوشحال یا بدحال، مضر یا نافع ومفید، سعید یا شقی، خوش وخرم یا غمزدہ وافسردہ بنانے پر کسی نہ کسی حد تک قادر ضرور ہوتا ہے۔

یہ بالکل بجا ہے کہ غباوت وذکاوت، ذہانت وبلادت، قوت وضعف، شجاعت وبزدلی، خوش خلقی وبدخلقی میں انسان پر موروثی اور ماحولیاتی وخاندانی اثرات لازماً پڑتے ہیں، تاہم انسان کا عزم راسخ، ہمت مردانہ، حوصلہ مندی، اور پختہ تربیت موروثی وماحولیاتی اثرات پر بڑی حد تک قابو یاب اور غالب ہو جاتے ہیں۔

انسان مثال کے طور پر اگر موروثی طور پر بیس فیصد ذہانت کا حامل ہے تو اپنے عمل وارادہ سے وہ اپنی ذہانت کو بیس سے سو فیصد تو نہیں کر سکتا مگر اپنی بیس فیصد کی محدود ذہانت کو اپنی عزیمت وتربیت کے نتیجہ میں اتنی اچھی طرح برموقعہ وبرمحل استعمال ضرور کر سکتا ہے کہ سو فیصدی ذہانت کے حامل کمزور ارادہ وعمل والے کے مقابلہ میں زیادہ فائدہ حاصل کر سکے اور پہونچا سکے، یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیس پاور کا بلب اگر بالکل صاف ستھرا ہوا تو اس کی روشنی سو پاور کے گندے بلب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے، اور متوسط درجہ کا آدمی خوراک وپوشاک میں اعتدال ونظافت اور حفظانِ صحت کے اصول کی رعایت کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کے اس آدمی سے فائق ہو جاتا ہے جو اعلیٰ خوراک وپوشاک تو استعمال کرتا ہو مگر اعتدال ونظافت اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی رعایت نہ کرتا ہو، اس طرح وراثت اور ماحول انسان کو زندگی کی

سعادتوں اور کامرانیوں سے نہیں روک پاتے اگر انسان ہمت، قوتِ ارادی اور قوتِ فکر وعمل سے مالا مال ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ انسان کو کبھی مایوس اور قنوطیت کا شکار نہ ہونا چاہئے، اور ہمیشہ اپنے مستقبل کے بارے میں بہتری اور کامیابی کی توقع رکھنی چاہئے، اسے کبھی یہ خیال کر کے افسردہ نہ ہونا چاہئے کہ بہتری دوسرے کے حصہ میں مقدر کر دی گئی ہے اور کامیابی دوسرے کے نصیب میں لکھ دی گئی ہے، اور کامیابی میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے، بلکہ اس کا عقیدہ یہ ہونا چاہئے کہ اللہ کی رحمت اس پر بھی سایہ فگن ہوگی، مستقبل میں وہ عنایتِ الٰہی سے ضرور بہرہ مند ہوگا، خدا کے ہاں دیر ضرور ہے اندھیر نہیں۔ قرآن کہتا ہے:

لَا تَيْأَسُوْا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ، إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ. (یوسف: ۸۷)

ترجمہ: اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، اللہ کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

بس عزم کر کے بے راہ روی اور رحمتِ الٰہی کے نزول میں حائل گناہوں کو ترک کر دے، اللہ کی رحمت بلا تاخیر اس کی طرف متوجہ ہوگی، یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ ''اور اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کو نبھانے والا کون ہو سکتا ہے''؟۔

اگر یہ خیال انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے کہ اس کا مستقبل بے حد تاریک ہے، روشنی کی کوئی کرن کبھی نمودار ہونے کی بالکل امید نہیں ہے، کوئی کامیابی کبھی اس کے دامن میں آنے کی نہیں ہے، تو یہ خیال زہر قاتل ہے جو انسان کو بے حد کمزور، پست حوصلہ، جامد اور مردہ بنا دیتا ہے، اس کے بالمقابل اگر انسان کامیابی و بھلائی کا امیدوار و منتظر ہو، حتی المقدور کوشاں ہو، وسائل و اسباب کے استعمال کے لئے حسبِ امکان ہاتھ پاؤں مارتا ہو تو

پھر کامیابی کے دروازے دھیرے دھیرے اس کے لئے کھلتے جاتے ہیں، اس کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے اور اس میں قوت پیدا اور زیادہ ہوتی جاتی ہے۔

جن لوگوں میں عام طور پر احساسِ برتری کبر کی حد تک پہونچا رہتا ہے، ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ فطری بلندی اور کمال کے ساتھ متصف ہیں، وہ بلا محنت و مشقت اعلیٰ مقام تک پہونچ سکتے ہیں، وہ طلسماتی کرتب سے مٹی کو سونا بنا سکتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ وہ خوش خیالیاں ہیں جو حقیقت کی دنیا میں ریت کی دیوار سے بھی زیادہ ناپائیدار ثابت ہوتی ہیں، عملی زندگی میں جس نے بھی قدم رکھا ہے، پہلے مرحلہ میں اسے تردد وخوف، پریشانیوں، ناموافق حالات اور مشکلات کا سامنا بہرحال کرنا پڑا ہے، پھر جو بھی عملی میدان میں کامیاب ہوا ہے وہ اسی لئے کامیاب ہوا ہے کہ اس نے اپنے اندرون کی روشنی، عزیمت وبصیرت اور عزم وحرکت سے قوت کشید کی، اور جوں جوں قدم آگے بڑھا تا گیا راستے ہموار ہوتے گئے، منزل آسان ہوتی گئی، دشواریاں دور ہوتی گئیں اور خوف وشک ختم ہوتا گیا، اور جلد بازی کے بجائے وہ بتدریج منزل بہ منزل چلتا ہوا بالآخر کامیابی کے آخری مرحلہ تک اپنے اندر کے عزم وہمت کی مدد سے پہنچ گیا، اب اگر پہلے ہی مرحلہ پر وہ ناامید ہوکر ہمت ہار جاتا تو وہ محروم رہ جاتا، مگر وہ مسلسل سعی وعمل میں لگا رہا اور بالآخر منزل مقصود تک پہنچ کر ہی دَم لیا۔

ہر دَور میں زندہ قوموں کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ عمل اور مسلسل عمل پر کاربند ہوتی ہیں، مایوسی اور پست حوصلگی جیسے الفاظ سے ان کا لغت خالی ہوتا ہے، ہماری موجودہ ناکامی کا بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ہم خود ساختہ اوہام واعذار اور مشکلات اور رکاوٹوں میں گھرے ہوئے ہیں، ہم نے اپنے ذہنوں سے خود اوہام ومشکلات پیدا کر لئے ہیں جن کا خارجی وجود یا تو ہے ہی نہیں یا ہے تو برائے نام ہے، کسی بھی کام میں کبھی ہم بدگمانی میں مبتلا ہوتے ہیں، کبھی متوقع نتائج کے حصول میں شک ہم میں پیدا ہوجاتا ہے، کبھی ناکامی کا خوف دامن گیر ہوتا ہے، کبھی

اپنی سستی اور غفلت آڑے آجاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس کام میں اپنی کامیابی کو ناممکن سمجھ کر اپنے حوصلے پست کردیتے ہیں اور ہمت ہار جاتے ہیں اور پھر محروم ہوجاتے ہیں۔

خوداعتمادی کا فقدان بہت بڑا مرض ہے، اسی نے ہم کو کمزور، مردہ دل، پست حوصلہ، جامد اور محروم بنادیا ہے، اور اسی نے ہماری حرکت، استقامت اور بلند نظری وعالی فکری کا خون کرڈالا ہے، ہم میں احساسِ کمتری جڑ پکڑ چکا ہے، اسی لئے سب ہم کو کہتر وادنیٰ سمجھنے لگے ہیں۔

خوداعتمادی کامیابی کے لئے بنیادی شرط ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی حدیں کبر وغرور سے نہ ملنے پائیں کیونکہ کبر بھی پستی کا اہم سبب ہے، اس مرحلہ پر بڑی احتیاط، باریک بینی اور دوراندیشی کی ضرورت ہوتی ہے، خوداعتمادی کا مطلب یہ ہے کہ اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی پر مکمل قدرت واستطاعت کا یقین آدمی میں پیدا ہوجائے اور وہ اپنی ذات اور اس کے تمام اچھے پہلوؤں سے بخوبی باخبر ہوجائے، جب کہ کبر وغرور کے معنیٰ اپنے کو اصل استحقاق سے زیادہ کے قابل سمجھنا، بغیر عمل کے مطلوبہ نتائج کا مطالبہ کرنا، دوسروں کو پست اور خود کو بالا سمجھنا وغیرہ ہیں۔

خوداعتمادی کے جوہرِ گراں مایہ سے آراستگی کے بعد انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام مشکلات کا خوشی خوشی مقابلہ کرے، مصائب میں الجھ کر مضطرب اور پریشان ہونے کے بجائے مسکرائے اور:۔

مصائب میں الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

کا مصداق بن جائے، مصائب کا خندہ روئی سے مقابلہ نجات کی راہیں کھول دیتا ہے، مصائب کے دور ہونے کا اہم سبب بنتا ہے، تجربہ یہ بتاتا ہے کہ مصائب وحالات کا ہنستے مسکراتے مقابلہ کرنے والے کامیابی اور سعادتوں سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔

انسان پر اللہ کی یہ بہت بڑی نعمت ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تاریک (Negative) پہلوؤں کے بجائے روشن (Positive) پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز رکھے۔

روشن دماغی، عالی فکری، رجائیت، ناامیدی و مایوسی سے دوری، خود اعتمادی، بلند حوصلگی، کبر و غرور سے بچاؤ، احساس کہتری سے دوری، مصائب کا ہنس کھیل کر مقابلہ کرنا اور بخوشی جھیل جانا...... یہ وہ بنیادی عناصر ہیں جن سے ایک بے حد خوشگوار زندگی کی تشکیل کی جاسکتی ہے، اگر یہ عناصر کسی زندگی میں جمع ہو جائیں تو وہ ایک قابل رشک زندگی ہوگی۔

معاملہ انسان کے اپنے اختیار میں ہے، چاہے تو محرومی کی زندگی گذارے اور چاہے تو ان عناصر پر اپنی زندگی کی عمارت استوار کر کے اسے قابلِ صد رشک و فخر زندگی بنائے، بقول شاعر: ع

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

نعمتِ گویائی کا شکر مطلوب ہے

فلاسفہ کا خیال ہے کہ انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، اور اس کا امتیازی وصف نطق (گویائی) ہے، گویائی فی الواقع اللہ کی عجیب وغریب نعمت ہے، یوں تو اللہ کی قدرت ہر شئ کو محیط ہے، وہ ہر چیز کو گویائی عطا کرسکتی ہے، اور قیامت میں محاسبہ کے ایک مرحلہ پر ایسا ہوگا بھی کہ انسان کی زبانیں گنگ اور منہ سربمہر کردیئے جائیں گے، اور ہاتھوں، پیروں، اعضاء بدن، اجزاءِ زمین سب گویا ہوجائیں گے اور انسان کے اعمال کے سلسلے میں حق کی شہادت دیں گے۔

لیکن اِس دنیا میں اللہ نے صرف انسانوں کو یہ امتیاز بخشا ہے کہ ان کی زبانوں میں گویائی کی قوت رکھ دی ہے، اگر کوئی محرومِ گویائی گونگا شخص اپنے جذبات کا اظہار کرسکے تب جاکر ہمیں اس نعمت کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے گا، گویائی کی قدران سے جانی جاسکتی ہے، جو اس سے محروم ہوں، اللہ تعالیٰ اپنی ہر نعمت کی قدردانی اور صحیح استعمال کا بندوں سے مطالبہ کرتا ہے، نعمتوں کی قدر اور جائز استعمال نہ کرنے والے ناشکری کے مرتکب ہوتے ہیں، اور وہ ہر لمحہ اپنے کو اللہ کے غضب کی طرف ڈھکیلتے چلے جاتے ہیں جس کا ایک مظہر بسا اوقات اُس نعمت سے محرومی کی شکل میں بھی سامنے آتا ہے۔

قوت گویائی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زبان پر آنے والے تمام الفاظ منہ سے نکال ہی دیئے جائیں؛ بلکہ ایک بندۂ خدا کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ زبان سے نکلنے والے تمام الفاظ کو پہلے شریعت کی چھلنی میں چھان لیا کرے، روایاتِ حدیث میں آتا ہے کہ بہت

سے کلمے جنت میں داخلہ کا سبب بنتے ہیں اور بہت سے جہنم میں داخلہ کا باعث ہوتے ہیں، بلکہ اچھی بات کو صدقہ قرار دیا گیا ہے اور جہنم سے آزادی کا سبب بتایا گیا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ میں زبان کے غلط استعمال سے بڑی سختی سے روکا گیا ہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ:

اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ.

ترجمہ: مسلمان وہ ہے جس کی دست درازیوں اور زبان درازیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

زبان کے غلط استعمال میں غیبت، چغلی، حسد، گالی، مذاق وغیرہ سبھی آجاتے ہیں۔

گویائی کی نعمت کا ایک حق یہ بھی ہے کہ سنجیدگی اور وقار کا التزام کیا جائے، بات کرتے وقت اسلوب وانداز متانت اور دھیما پن لئے ہوئے ہو، بیجا شدت وسختی مخاطب کو بدگمان کرنے کے ساتھ ہی انسان کی اپنی سیرت کی تعمیر میں مضر ثابت ہوتی ہے۔

گفتگو کس انداز میں کی جائے؟ کون سے موقعہ پر کیا اسلوب اپنایا جائے؟ یہ ایک مستقل باضابطہ فن ہے، اپنی فطری ذکاوت، مخاطب کی نفسیات وغیرہ کی مدد سے انسان یہ فن بآسانی سیکھ سکتا ہے، مخاطب کبھی تعظیمی انداز سے، کبھی عقلی گفتگو سے، کبھی جذباتی انداز سے، کبھی اختصار اور کبھی تفصیل سے متأثر ہوتا ہے اور اچھا متکلم ان سب کی رعایت رکھتے ہوئے اپنے مقاصد میں بامراد ہوجاتا ہے۔

ایک بچہ اپنے باپ کے پاس آکر بلاتمہید وسلام پیسے کا مطالبہ کرتا ہے، باپ کہتا ہے: میں نے تم کو کل پیسے دیئے تھے اب کیا روز آنہ دوں؟ منع کردیتا ہے، دوسرا بچہ آتا ہے، سلام کرتا ہے، ادب وتواضع کا مظاہرہ کرتا ہے، پھر کہتا ہے: ابا جان! آپ نے کل پیسے دیئے تھے، وہ خرچ ہوگئے، آج مزید ضرورت ہے، میں بار بار مانگتے ہوئے شرمندہ ہوں، اب آئندہ

احتیاط سے خرچ کروں گا، باپ اس بیٹے کی پیٹھ تھپتھپاتا ہے اور کہتا ہے: بیٹے شرمندگی کی کیا بات ہے؟ اور پھر مزید پیسے دے دیتا ہے۔

ایک بچہ کو نہ دے کر اور دوسرے کو دے کر باپ نے غلط نہیں کیا، بلکہ پہلے کو نہ دے کر اس کی بے ادبی اور غلط اندازِ گفتگو کی سزا دی اور دوسرے کو اس کے ادب وحسنِ انداز کا انعام دیا۔

عقل مند بیویاں جو اپنے خاوند کی مزاج شناس ہوتی ہیں وہ بھی اپنے مطالبات مناسب موقعوں پر مناسب انداز میں رکھتی اور منوالیتی ہیں جب کہ پھوہڑ عورتیں موقعہ ناشناسی اور سخت کلامی کی وجہ سے محروم رہ جاتی ہیں۔

الفاظ کے زیر وبم، لہجات وانداز کا مخاطب کی طبیعت پر گہرا اثر پڑتا ہے، اسی طرح متکلم کے چہرہ کے نقوش اور زاویے بھی اس کی اندرونی حالت کی تصویر کشی کرتے ہیں، انسان کا چہرہ ایک کھلی کتاب کی طرح ہوتا ہے جس سے اس کے اندرون کی کیفیات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے، خوش اخلاقی وبداخلاقی، تواضع وتکبر، معصومیت وڈھٹائی، شرم وبے شرمی، سنجیدگی وشوخی سب کا اندازہ ایک حساس آدمی کو چہرے کے نقوش اور زاویوں سے بیک لمحہ ہوجاتا ہے۔

بلکہ بات کا لہجہ اور چہرہ کے نقوش الفاظ کے معانی تک کو بدل ڈالتے ہیں، تعزیت کے موقعہ پر مسکرا کر ہنستے ہوئے ہشاش بشاش چہرہ کے ساتھ خوشی کے انداز میں تعزیتی الفاظ کہنا یا خوشی کے موقعہ پر اشکبار حالت میں، گلوگیر انداز میں غمناک چہرہ کے ساتھ مبارکبادی کے الفاظ کہنا دراصل تعزیت وتہنیت کے معانی کو بدلنا ہے، یہی حال ان کا بھی ہوتا ہے جو قرآن کی آیاتِ عذاب وانذار کو خوش کن آواز اور اسلوب میں اور آیاتِ ثواب وبشارت کو غمناک آواز واسلوب میں پڑھتے ہیں۔

اندازِ گفتگو سے انسان کی شخصیت کا وزن بھی ہوتا ہے، خوبصورت بدزبان انسان ہرگز بدصورت خوش زبان پر فائق نہیں ہوسکتا، سنجیدہ ومتین اسلوب آدمی کی سنجیدگی اور وقار کی علامت ہوتا ہے جب کہ غیر سنجیدہ سخت انداز آدمی کے پھکڑ پن اور ہلکے پن کا ثبوت ہوتا ہے۔

اسلام کا یہ مطالبہ ہے کہ انسان قوت گویائی کو اللہ کی نعمت سمجھ کر اسے صحیح مصرف میں صحیح انداز میں صرف کرے، اور اپنے طرزِ عمل سے کبھی اس نعمت کی ناشکری نہ کرے، نعمتیں اللہ نے آزمائش کے لئے دی ہیں۔

''اب جو شکر کرے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے ورنہ کوئی ناشکری کرے تو اللہ بے نیاز اور بزرگ و برتر ہے''۔ (النمل:۴۰)

دولتِ احساس واخلاص

شہروں میں شاہراہوں پر ٹریفک سگنل اور ٹریفک پولیس کا انتظام ونظام ٹریفک کے نظام کو درست کرنے، بے ہنگم ہجوم کو کنٹرول کرنے اور سہولت پیدا کرنے کے لئے ہوتا ہے، ہر کسی کو اس نظام کی پابندی کرنی ہوتی ہے، اس میں کوئی استثناء نہیں ہوتا، ٹریفک پولیس کے اشاروں کی تعمیل ہر راہ گذر کو لازماً کرنی ہوتی ہے ورنہ بصورتِ دیگر سزا ملتی ہے۔

لیکن داعی اور معلم کی زبان، حکم اور اشارے کی تعمیل اس طرح نہیں ہوتی جیسی ٹریفک پولیس کی، داعی خیر کی دعوت دیتا ہے، شر سے روکتا ہے، معلم اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے اور اخلاقِ بد سے منع کرتا ہے، مگر مدعو اور طلبہ پر داعی اور معلم کی باتوں کا برائے نام ہی اثر ہوتا ہے، داعی مال داروں کو فقراء پر خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، سست وکاہل کو حرکت وعمل پر ابھارتا ہے، اصحابِ اقتدار کو عدل کا پیغام سناتا ہے، اور اس کے لئے تحریری وتقریری ہر طرح کے وسائل اختیار کرتا ہے مگر اس کی دعوت عموماً بے اثر ثابت ہوجاتی ہے، اس کی دعوت کی تعمیل ٹریفک پولیس کے اشاروں کی تعمیل کی طرح نہیں ہوتی۔

والدین اولاد کو اچھی تربیت دینا چاہتے ہیں، محنت وکوشش کرتے ہیں، نرمی وسختی ہر طرح سمجھاتے ہیں مگر اولاد عام طور پر غلط راہوں پر چل پڑتی ہے اور والدین کفِ افسوس ملتے رہ جاتے ہیں۔

تھوڑا سا غور وفکر کیا جائے تو یہ فرق سمجھ میں آتا ہے کہ ٹریفک پولیس کے احکام کی تعمیل کا سبب دراصل اس کی اپنی شخصیت کی سحر انگیزی نہیں؛ بلکہ اس سزا اور پریشانیوں کا خطرہ ہے جو

ٹریفک نظام کی مخالفت کی صورت میں اسے لاحق ہوگا، یہ سزا قید، جرمانہ وغیرہ مختلف شکلوں میں ہوتی ہے جس سے بچنے کی خواہش انسان کو ٹریفک قانون کی مکمل رعایت کا پابند بنادیتی ہے۔

دوسری طرف داعی اور معلم کے احکام کی تعمیل نہ کیے جانے کا عام سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نقد دنیوی نقصان اور مادّی خسارہ سامنے نہیں آتا، قرآنی بیان کے مطابق یہ حقیقت تو ناقابل انکار ہے کہ انسان پر مصائب وحوادث کا نزول ان کے اپنے برے کرتوت اور بے راہ رویوں کے نتیجہ میں ہوتا ہے، لیکن احساس اور حقیقت تک رسائی کی دولت اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت ہر کِہ ومِہ کو نہیں خاص لوگوں کو ہی عطا ہوتی ہے، اس لئے عام طور پر انسان اس پر غور نہیں کرتا کہ اس پر مصیبتیں کیوں آئیں، اسباب کی جستجو کے بعد اس کے ازالہ کی فکر کے بجائے وہ جزع فزع پر اتر آتا ہے، اپنی بے بصیرتی کی بنیاد پر وہ داعی ومعلم کی دعوتِ خیر اور تعلیمِ خیر پر عمل نہیں کرتا اور اسے اپنی اس بے عملی میں کوئی ظاہری نقصان نظر نہیں آتا، نتیجۃً وہ اپنی گناہوں میں ملوث زندگی میں مست ودیوانہ رہتا ہے اور خیر وحق کی طرف اپنی عنان توجہ نہیں موڑتا، حالانکہ اگر وہ دلِ بینا اور دیدۂ عبرت نگاہ کا صحیح استعمال کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ خیر سے دوری، بے راہ روی، اور بدعملی انسان کو جہنم کے اس ہولناک ودردناک عذاب کی طرف کشاں کشاں لے جارہی ہے جس کو دنیاوی سزاؤں اور مصائب سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے، اور جو چند روزہ نہیں؛ بلکہ دائمی اور ابدی ہے، اگر اس دائمی عذاب کا احساس آدمی کو ہوجائے تو وہ یک لخت ساری بدعملیوں سے گریزاں اور کنارہ کش ہوجائے، عذابِ آخرت کے سوا دنیوی مصائب بھی چونکہ انسان کے اپنے عمل کے نتیجہ میں آتے ہیں، اس لئے اس پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

آج دعوتی وتعلیمی سرگرمیوں کے بے اثر ہونے کی اصل وجہ ہماری بے حسی اور صحیح شعور سے محرومی ہے، دنیوی رونقوں میں بدمستی اور مادّی دولتوں کی بے پناہ حرص نے خوفِ خدا، عذابِ آخرت وغیرہ کا احساس ہی سلب کرلیا ہے، احساس کا خاتمہ سب سے بڑی محرومی ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

احساس دوبارہ بیدار وزندہ کرنے کی صورت یہی ہے کہ گناہوں سے دامن کو الجھنے نہ دیا جائے، کسی مصلح ومربی کی تربیت میں کچھ وقت گذارا جائے، کتاب وسنت کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے۔

دعوتی کاموں کے بے اثر ہونے کی ایک اور وجہ ہے اور وہ داعی کی ذاتی بے عملی اور دولتِ اخلاص سے محرومی ہے، دعوتی کام کرنے والے افراد اگر خود اپنی دعوت میں اخلاص وبے لوثی پیدا کرلیں، اپنی اصلاح کے بعد دوسروں کی اصلاح کا مشن شروع کریں اور ان کی دعوت ان کے اندرون کی صدا اور ان کے دل کی آواز ہو تو اس کی تاثیر بالکل یقینی ہے، ماضی میں دعوتی کاموں کے مؤثر ہونے کا ایک اہم سبب داعی کا اپنا عمل واخلاص تھا، چنانچہ اس سے زندگیاں بدلیں، معاشرہ کی کایا پلٹی، انقلاب آیا اور دنیا نے دیکھ لیا، واقعہ یہی ہے کہ

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

پَر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اخلاص سے محرومی کا نتیجہ آخرت میں کیا ہوگا؟ حضرت ابوہریرہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ:

إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضىٰ عَلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ اُسْتُشْهِدَ، فَأُتِىَ بِهٖ، فَعَرَّفَهُ نِعْمَتَهُ، فَعَرَفَهَا، فَقَالَ فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِيْكَ حَتّٰى اسْتُشْهِدْتُّ قَالَ كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ قَاتَلْتَ لِأَنْ يُّقَالَ جَرِئٌ، فَقَدْ قِيْلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهٖ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهٖ حَتّٰى أُلْقِىَ فِي النَّارِ. (صحیح مسلم)

ترجمہ: قیامت کے روز سب سے پہلے جس کے خلاف فیصلہ سنایا جائے

گا وہ شخص ہوگا جو شہید ہوا ہوگا، وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا، تو اللہ اسے اپنی نعمتیں یاد دلائے گا، وہ ان کا اعتراف کرے گا، خدا پوچھے گا کہ نے تو ان نعمتوں سے کیا کام لیا؟ وہ جواب دے گا کہ میں نے تیرے لئے جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوگیا، اللہ فرمائے گا کہ تو نے جھوٹ کہا، واقعہ یہ ہے کہ تو نے لوگوں میں اپنی بہادری کے چرچے کے لئے جنگ کی، دنیا میں تجھے تیری خواہش کے مطابق بہادر کہا جاچکا، پھر اللہ کے حکم کے مطابق اسے منھ کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا، اور ایک دوسرا عالم و معلم اور قرآن کا جاننے والا شخص اللہ کے حضور پیش ہوگا، اس سے بھی وہی سوال ہوگا، پھر اللہ کہے گا کہ تو نے اپنے علم و قراءت کی شہرت کے مقصد سے یہ کام کیا ہے، وہ مقصد پورا ہو چکا ہے، پھر اسے بھی منھ کے بل گھسیٹا اور داخلِ جہنم کردیا جائے گا، یہی حالت سخاوت و فیاضی کی شہرت کی غرض سے مال خرچ کرنے والے دولت مند کی بھی ہوگی۔

ایک حدیث میں بے عمل واعظ و عالم کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ جہنم میں بدترین سزا میں مبتلا ہوں گے، شدتِ عذاب سے ان کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی۔

واقعہ یہی ہے کہ بڑے سے بڑا عمل اور کارنامہ اگر رضائے الٰہی کے جذبہ سے خالی ہو تو وہ اللہ کی نگاہ میں بالکل بے مایہ اور ہیچ ہوتا ہے، صحتِ نیت اور اخلاص اصل مطلوب ہے۔

دعوتی و تعلیمی اعمال کی تاثیر و تسخیر کے لئے داعی و معلم کا اخلاص، قوت عمل، بے لوثی اور صحت نیت کلیدی شرائط میں شامل ہیں، ساتھ ہی معاشرہ پر طاری بے حسی اور شعور سے محرومی بھی نیکیوں کی مدد سے دور ہوجائے اور چھٹ جائے تو صالح، ہمہ گیر اور زبردست انقلاب کے برپا ہونے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔ انشاء اللہ۔

انسانِ کامل

انسان کامل(Super Man) کی تحدید وتعیین میں وصف نگاروں کی آراء میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، اہل مشرق عام طور پر انبیائے کرام کو کامل انسان سمجھتے ہیں، اس لئے کہ انبیاء اللہ کے وہ منتخب، برگزیدہ اور چیدہ وچنیدہ بندے ہوتے ہیں جو انسانوں اور اللہ کے درمیان رابطہ اور پیغامبری کی ذمہ داریاں انجام دیتے ہیں، وہ اللہ کے بعد اس روئے زمین کے تمام انسانوں سے برتر ہوتے ہیں: ع

بعد از خدا بزرگ توئی ایں قصہ مختصر

صوفیائے کرام اور اصحاب تزکیہ واحسان نے انسان کامل کا لفظ خوب استعمال کیا ہے، ابن العربی کی کتابوں میں اس کا ذکر جا بجا ملتا ہے، عبدالکریم جیلانی نے ''انسانِ کامل'' کے عنوان سے ایک باضابطہ کتاب بھی لکھی ہے، جس میں صوفیہ کا نقطۂ نظر بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کامل وہ ہے جو اللہ سے اتنا قریب ہوجائے کہ فنائیت کے مقام تک پہنچ جائے، ماسوا اللہ کا خیال تک اس کے دل میں نہ آئے، اس مقام بلند پر انبیاء واولیاء اور اللہ کے صالح بندے فائز ہوتے ہیں، اس مقام پر پہنچنے کے بعد انسان کامل ہوجاتا ہے، شریعت اس کا مزاج وطبیعت بن جاتی ہے، ایمان کی لذت اور چاشنی وہ محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے دل کی دنیا میں عجیب انقلاب آجاتا ہے۔

اہل مغرب ویورپ کے ہاں مادّہ پرستی اور شہوت پرستی کے افراط نے تمام قدریں ہی بدل ڈالیں، ان کا نقطۂ نظر صوفیہ کے نقطۂ نظر کے بالکل برعکس ہے، صوفیہ کی نگاہ میں روحانیت، خدا سے بے پایاں قرب، فنائیت، مادّہ پرستی سے گریز وفرار ہی کامل انسانیت کے مقام تک

پہونچانے کے اہم عناصر ہیں، جب کہ اہل یورپ کی نگاہ میں انسان کامل وہ ہے جو حد سے زیادہ مادّہ پرست، شہوت پرست، ملحد و بے دین ہو، بعض مغربی مفکرین نے انسان کامل کا دارومدار قوت پر رکھا ہے کہ جو شخص قوت، مردانگی، بہادری، اقدام ودلیری جیسے اوصاف کا حامل ہو وہی کامل انسان ہے، تواضع، رحمدلی، منکسر المزاجی، اقدام سے گریز ناقص انسان کی علامتیں ہیں، کاملیت کے لئے قوت ارادہ اور سختی ضروری ہے، جب بھی کسی چیز کا ارادہ کرلیا جائے اسے کر کے ہی چھوڑا جائے، کسی پر رحم وترس نہ کھایا جائے، اپنے ارادوں کی تنفیذ کے بعد اس پر ہرگز نادم و پشیمان نہ ہوا جائے، گویا کامل انسانیت طاقت، سختی، تندرستی، جسمانی و مادّی قوت، اور سنگ دلی میں منحصر ہے، اب جو نظامِ حیات نرمی، شفقت محتاجوں و پریشان حالوں پر مہربانی کی دعوت دیتا ہے وہ ناقص انسانیت کی دعوت دیتا ہے، اور مجبور و بیمار، غریب ومحتاج، کمزور وذلیل، اور نرم ومتواضع انسان کامل انسانیت کی راہ میں حائل روڑے ہیں جنہیں ہٹا دینا چاہئے۔

ان کج فکر مفکرین نے اپنی اس تشریح کی روشنی میں قوم کو اس طرف بلایا ہے کہ پوری توجہ ایسے کامل انسان کی نشو ونما پر صرف کی جائے، اس کے لئے غرباء ومحتاجین کو پس پشت ڈال دیا اور قربان کر دیا جائے، اصل مقصود مذکورہ بالا اوصاف کے حامل کامل انسانوں کی ایک کھیپ تیار کرنا ہے۔

گویا مساوات کی حقیقی روح، نرمی ومہربانی کے اعلیٰ اخلاقی اصول واقدار، اور وحدتِ امت کے گراں مایہ جوہر سے اِس ناقص فکر کا دامن بالکل خالی ہے، اور اس میں مادّی واقتصادی عارضی پہلوؤں کے سامنے اصل روحانی پہلو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

انسان کامل کی راست تصویر وہی ہے کہ اس کی زندگی کے مادّی وروحانی دونوں پہلوؤں میں روحانی پہلو غالب ہو، مگر مادّی پہلو بالکل نہ ہو یہ افراط ہے جو اعتدال سے ذرا بھی میل نہیں کھاتا، واقعہ یہ ہے کہ مؤمن صادق اور انسانِ کامل ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں، توحیدِ خالص کا عقیدہ انسان کو بندۂ انسان اور بندۂ مال وزر بننے سے روکتا ہے، اس کی

روحانی قوت کے ذریعہ دوسروں سے اسے ممتاز کرتا ہے، اس کی وسعت وآفاقیت کے ذریعہ رنگ ونسل اور وطن کے امتیازات کی جڑ کاٹ دیتا ہے، اسے مساواتِ حقیقی کا علمبردار بنادیتا ہے، مؤمن صادق کے پاس زندگی کا ایک پیام ہوتا ہے جس کے تحت وہ زندگی گذارتا ہے، زمانہ کتنا بدل کیوں نہ جائے، تصورات واقدار کتنے تبدیل کیوں نہ ہوجائیں پر اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، وہ جوں کا توں اپنے نظام پر کاربند رہتا ہے۔

مؤمن صادق اپنے انسانی وجود کے لحاظ سے تو تمام انسانوں کی طرح ہوتا ہے، طبعی قانون کا وہ بھی سب ہی کی طرح تابع ہوتا ہے لیکن اس کا ایمانی وجود اسے روشن، نمایاں اور ممتاز کردیتا ہے، یہی چیز اسے جاودانی عطا کردیتی ہے، اس کے پاس زندۂ جاوید پیام ہوتا ہے، اس کے سینے میں ایک زندۂ جاوید امانت مستور ہوتی ہے، اس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک زندۂ جاوید مقصد کے لئے وقف رہتا ہے: ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اُس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم وخلیل

اس کا نظریۂ زندگی یہ نہیں ہوتا کہ خود کو ماحول وحالات کے تابع کردیا جائے بلکہ زمانہ وماحول اگر ناسازگار ہو تو اس کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا جائے، معاشرہ راہِ راست سے ہٹا ہوا ہو تو اس سے جنگ کی جائے، اور راہِ راست سے سرِ مو انحراف کو کبھی گوارا نہ کیا جائے، زندگی کی غلط وفاسد اقدار سے کبھی مصالحت ومفاہمت نہ کی جائے ان سے نبرد آزما ہوا جائے، اور بگڑی ہوئی قدروں کی اصلاح کی جائے۔

مؤمن صادق کی اندرونی وبیرونی دونوں زندگی ہر وقت وہر آن عمل، حرکت، محبت، انسانیت اور اخلاق عالیہ سے لبریز رہتی ہے، وہ سراسر عمل ہوتا ہے، وہ کردار کا غازی ہوتا ہے۔

انبیائے کرام نے ہر دور میں ایسے ہی افراد پر مشتمل ایک صالح معاشرہ تیار کیا، اور

انبیاء کے بعد صحابہ وتابعین اور مجددین و مصلحین نے ہر دور میں یہی کام کیا ہے، اور آج بھی اس کی سخت ضرورت ہے۔

آج ہمارا ایک بہت بڑا المیہ ایسے کامل انسانوں اور سچے مسلمانوں سے محرومی ہے جو باضمیر اور سراپا عمل وحرکت ہوں، جو کبھی خریدے نہ جاسکتے ہوں، جنہیں کسی خوف سے دبایا نہ جاسکتا ہو، جو غلط قدروں سے کبھی سمجھوتہ (Compromise) کرنے پر آمادہ نہ ہوسکیں، اور جن کا وجود باطل کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج ثابت ہوتا رہے۔

دشمنانِ اسلام نے اپنی تخریبی منصوبہ بندیوں کے ذریعہ ہمہ نوعی اسباب ووسائل کی بے پناہ قوت سے اپنا سارا زور اسی پر صرف کردیا ہے کہ مسلمانوں میں ایسے کامل افراد دوبارہ ابھرنے نہ پائیں، مغربی نظام معاشرت اور نظام تعلیم کے ذریعہ، میڈیا اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے اور اقتصادی قوتوں کا تمامتر استعمال کرکے دشمنوں نے مسلمانوں میں وہ مادّی نقطۂ نظر پیدا کرنے پر توجہ دی جو ان کو بلند اخلاقی اقدار اور خود اعتمادی سے محروم وتہی دست کردے، ان کی خواہش یہ رہی کہ:؂

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

دشمنوں کی ان کوششوں اور خواہشوں کو کافی کامیابی بھی میسر آئی ہے، تاہم تمامتر بگاڑ اور فساد کے باوجود، عمل اور پیہم عمل، اخلاص اور جاں فشانی سے ساری دشمنانہ سازشیں اور کاوشیں ناکام بنائی جاسکتی ہیں، شرط یہ ہے کہ ایمان صادق وراسخ کی روح سے معمور افراد اس کام کا بیڑا اٹھائیں اور پورے معاشرہ میں ایمان کامل کی لہر دوڑانے میں اپنی ہر ممکن کوشش صرف کردیں، مخلصانہ کوششوں کی مقبولیت کی ضمانت قرآن وحدیث نے لی ہے، اور اس سے سچی ضمانت کوئی اور کبھی بھی نہیں ہوسکتی۔

موت سامانِ عبرت ہے

موت انسانی زندگی کا فطری نتیجہ ہے جس کا ظہور بالکل یقینی ہے بقول شاعر: ۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ اِنہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

مگراس کے باوجود ہر شخص موت سے خوف زدہ رہتا ہے، اسے مصیبت عظمیٰ باور کرتا ہے، جاہ ومنصب، مال ودولت، عہدہ واقتدار سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور موت اپنے بے رحم پنجے گاڑ دیتی ہے، یہ اللہ کا قانون ہے جو کسی تبدیلی سے کبھی آشنا نہیں ہوتا، موت کسی پر رحم نہیں کرتی، جوانوں کی مکمل جوانی، عظیم انسانوں کی عظمت وعبقریت، صحت مندوں کی صحت وتندرستی، کوئی بھی چیز موت کی راہ میں حائل نہیں ہوتی بلکہ:

کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ.

ترجمہ: ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ضرور ہے۔

زندگی ایک بے سہارا تنکے یا پانی کے بلبلے کی طرح ناپائیدار ہوتی ہے، متکبروں کا سارا کبر ونخوت، مالداروں کا پندارِ دولت وثروت، اصحاب اقتدار کا غرور وتمکنت سب موت کے سامنے ڈھے جاتے ہیں اور ذرّہ بے مقدار سے بھی زیادہ بے حیثیت ہوجاتے ہیں، سکندر رومی کے بارے میں مشہور ہے کہ جب وہ مرا تو اس کی لاش کے پاس کچھ فلاسفر اکٹھا ہوئے اور یہ طے کیا کہ ہم میں سے ہر کوئی اس حادثۂ موت پر تبصرہ کرے اور مختصر جملہ بولے جس میں خواص کے لئے سامانِ تعزیت اور عوام کے لئے سامانِ وعظ ونصیحت ہو، چنانچہ پہلے فلسفی

نے لاش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اے بولنے والے تجھے کس نے گونگا کر دیا؟ اے باعزت تجھے کس نے ذلیل کر دیا؟ اے شکاری تو خود جال میں کیسے پھنس کر شکار بن گیا اور کس نے تیرا شکار کرلیا؟ دوسرے نے کہا یہ توانا تھا جو آج ناتواں اور بے بس ہوگیا، یہ باعزت تھا جو آج بے عزت ہوگیا، تیسرے نے کہا تمہاری تلواریں کبھی خون سے خشک نہ ہوتی تھیں، تمہارے انتقام اور سزا کا ہر دم خطرہ سب کو رہتا تھا، تمہارے مفتوحہ علاقوں کی طرف کسی کی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی ہمت نہ تھی، تمہارے عطیات بے پناہ تھے، تمہاری روشنی گُل نہ ہوتی تھی مگر آج تمہاری روشنی بجھ چکی ہے، تمہارے انتقام وسزا کا کسی کو خطرہ نہیں، تمہارے عطیات کی توقع معدوم ہوچکی، تمہاری تلواریں بیکار ہیں اور تمہارے علاقوں پر دشمنوں کی نظرِ بد ہے، چوتھے نے کہا تم بادشاہوں کے بادشاہ تھے، آج تم بازاری اور عام لوگوں کے سامنے بے بس ہو، پانچواں بولا تمہاری آواز ہولناک ومرعوب کن تھی، تمہاری سلطنت غالب تھی، اب آواز بند ہے اور سلطنت ضائع ہورہی ہے، چھٹے نے کہا تم سونے والے کا خواب تھے یا بدلی کا وقتی سایہ، ساتویں نے کہا کل تم سے کوئی مامون نہ تھا آج سب بے خوف ہیں، آٹھویں نے کہا، یہ وسیع وعریض دنیا دو ہاتھ کی قبر میں لپیٹ دی جائے گی۔

اس واقعہ کی تاریخی حیثیت وواقعیت گو مشکوک سہی تاہم اس میں بہت کچھ سامانِ عبرت ونصیحت ہے۔

قبیلۂ بنو بویہہ کے معروف بادشاہ عضد الدولہ کے بارے میں آتا ہے کہ بیحد بارعب اور متکبر بادشاہ تھا، زمامِ حکومت سنبھالنے کے بعد اس نے ملکی نظم ونسق فوراً درست کر دیا، فسادیوں کا قلع قمع کر دیا، جاسوس متعین کر دیئے اور لمحہ لمحہ کی خبر رکھی حتی کہ میاں بیوی اور غلام وآقا تک ایک دوسرے سے ڈرنے لگے، بیحد بے رحم تھا، نہ جانے کتنے معصوموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، پھر وہ ایک باندی کے عشق میں مبتلا ہوگیا اور پورپورا اسی میں ڈوب گیا، اس کی

حکومت کا دائرہ بیحد وسیع تھا، اس کا رعب و دبدبہ سب پر طاری تھا، مگر پھر کیا ہوا؟ ۷۴ رسال کی عمر میں اسے مہلک امراض نے آگھیرا، کوئی دوا کام نہ آسکی، اس نے خود اپنی حالتِ زار کا رونا شعری زبان میں رویا جس میں اس نے کہا کہ میں نے بڑوں بڑوں کو قتل کرڈالا، کسی دشمن کو مہلت نہ دی، اپنا رعب بٹھایا، اب جب عیش کا وقت آیا تو ہلاکت وموت کا تیر مجھ پر آگرا، میرا جوش سرد ہوگیا اب میں بیکار و معطل کمرے میں پڑا ہوں، نہ میرا مال میرے کام آرہا ہے اور نہ جاہ واقتدار، سب چھن گیا اور کچھ نہ بچا، بالآخر اسی عالم میں وہ ختم ہوگیا، اس کی موت پر بھی فلسفیوں نے اسی طرح تبصرہ کیا جیسا سکندر کی موت پر کیا تھا، الفاظ کا فرق ضرور ہے مگر باتیں وہی ہیں۔

قارون کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

''یہ ایک واقعہ ہے کہ قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہوگیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی، ایک دفعہ جب اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا پھول نہ جاؤ اللہ پھولنے والے کو پسند نہیں کرتا تو اس نے کہا کہ یہ سب کچھ تو مجھے اس علم کی بنیاد پر دیا گیا ہے جو مجھ کو حاصل ہے، آخرکار ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا پھر کوئی اس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلہ میں اس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کرسکا۔'' (سورۃ القصص)

موت اور عذاب الٰہی نے قارون کی طرح فرعون وہامان، قوم نوح، عاد وثمود اور پھر رؤساء قریش ابوجہل وابولہب وغیرہ سب کے غرور کو خاک میں ملا دیا۔

واقعہ یہی ہے کہ: ؎

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

اس لئے نہ کسی دولت مند کے لئے اپنی دولت پر ناز کا جواز ہے اور نہ کسی با اقتدار کے لئے اپنے اقتدار پر اتراہٹ کا، موت ہر ایک کے لئے عبرت ہے، اور اسی کو حدیث میں ''هَاذِمُ اللَّذَّاتِ'' (تمام لذتیں ختم کرنے والی چیز) قرار دیا گیا ہے اور کثرت سے یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں دنیوی زندگی اور اس کی رونقوں کو ''مَتَاعُ الْغُرُوْرِ'' (دھوکے کا سامان) قرار دیا گیا اور اصل توجہ موت کے بعد کی زندگی پر مرکوز کرنے کی تاکید آئی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ کا یہ جملہ آبِ زر سے اور لوحِ قلب پر لکھنے کے قابل ہے کہ:

مَا أَكْثَرَ الْمُعْتَبَرَ وَأَقَلَّ الْمُعْتَبِرَ.

ترجمہ: سامانِ عبرت بہت ہے مگر عبرت حاصل کرنے والے بہت کم۔

اور یہی صورتحال سب سے خطرناک ہے۔

نفس پرستی

مؤمن صادق کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ خیر پسند، شر سے نفور وگریزاں ہوتا ہے، اس کا دل تعلیماتِ نبوت پر مطمئن ہوتا ہے، جس شخص میں خیر پسندی، شر سے گریز اور ہدایاتِ نبوت پر اطمینان کا جوہر مفقود ہو تو اسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ منافق ہے۔

دراصل خواہشِ نفس وہ بلا ہے جو انسان کو گمراہی اور ہلاکت کی راہوں پر لے جاتی ہے، قرآن کریم میں خواہش پرستوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ، وَأَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلىٰ عِلْمٍ، وَخَتَمَ عَلىٰ سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ، وَجَعَلَ عَلىٰ بَصَرِهٖ غِشَاوَةً، فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ، أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ. (الجاثية: ٢٣)

ترجمہ: پھر کیا تم نے کبھی اس شخص کے حال پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنالیا اور اللہ نے علم کے باوجود اسے گمراہی میں پھینک دیا اور اس کے دل اور کانوں پر مہر لگادی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا؟ اللہ کے بعد اب کون ہے جو اُسے ہدایت دے؟ کیا تم لوگ کوئی سبق نہیں لیتے؟

اس آیت میں کافروں کے چار اوصاف کا بیان ہوا ہے:

(۱) خواہش پرستی۔

(۲) دانستہ گمراہی و بے راہ روی۔

(۳) دلوں اور کانوں پر منجانب اللہ مہر کا لگ جانا۔

(۴) آنکھوں پر پردہ پڑ جانا۔

یہ چاروں اوصاف انسان کو گمراہ و بدراہ کر دیتے ہیں، خواہش پرست انسان پاکیزہ اور غلیظ میں فرق نہیں کرتا اور بدستور بربادی کی طرف چلتا ہی رہتا ہے۔ شریعت کے اساسی مقاصد ولوازم میں خواہشِ نفس، اور شیطانِ ملعون سے جنگ اور مقابلہ اور انہیں مغلوب و بے اثر کرنا ہے، توحید ووحدانیت کا مقصد کبر وغرور اور نخوت وتکبر کے عناصر سے جنگ ہوتا ہے، نماز کے مقاصد میں سستی و بیکاری سے، اور زکوٰۃ کے مقاصد میں زر پرستی اور بخل وحرص کے جذبات سے مقابلہ شامل ہے، روزہ کا مقصد کھانے پینے سے اور نفس کی سرکشی سے روکنا ہے، جہاد کا مقصد دنیا پرستی اور اپنی جان کی بیجا محبت کے عناصر پر بندش لگانا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ خداوند قدوس کا منشأ یہ ہے کہ انسان روحانی اور اخلاقی کمال و جمال کا اعلیٰ ترین نمونہ بن جائے، اور خواہش نفس سے بالکل دور رہے، خواہش نفس ہی وہ بلا ہے جو اہل کفر وباطل کے حق سے منحرف ہونے اور راہِ راست سے بھٹکتے رہنے کی بنیادی وجہ ہوتی ہے۔ قرآن میں اس کا ذکر فرمایا گیا ہے:

فَإِنْ لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ أَهْوَآءَ هُمْ، وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدىً مِنَ اللّٰهِ، إِنَّ اللّٰهَ لَايَهْدِىْ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ. (القصص: ۵۰)

ترجمہ: اگر وہ آپ کی بات نہیں مانتے تو آپ سمجھ لیجئے کہ دراصل وہ اپنی خواہشات کے پیرو ہیں، اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے، اللہ ایسے ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں بخشتا۔

ہوائے نفس ہی وہ شرّی قوت ہے جو انسان کو شر پر آمادہ کرتی ہے، وہی ہر جرم کا محرک، ہر گناہ کا باعث، ہر معصیت کا سبب اور ہر سرکشی کا سرچشمہ ثابت ہوتی ہے، انبیاء کی

تکذیب، رسولوں کی مخالفت، بتوں اور معبودانِ باطل کی پرستش، کتب سماویہ کی توہین و بے حرمتی، ہمہ وقت خونریزیوں، سودخوری، شراب نوشی اورتمام جرائم کے پس پردہ یہی اتباعِ ہویٰ کا عنصر کارفرما ہوتا ہے، انبیاء ورسل کی راہِ دعوت میں یہ عنصر بار بار روڑا بنتا رہا ہے، قرآن میں اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

أَفَكُلَّمَا جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰىٓ أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقاً كَذَّبْتُمْ، وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ. (البقرۃ: ۸۷)

ترجمہ: پھر یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا تو تم نے اس کے مقابلہ میں سرکشی ہی کی، کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔

قرآن کریم میں خواہش پرست انسان کو اس کتے سے تشبیہ دی گئی ہے جس کی ہمہ وقت لٹکتی زبان اور ٹپکتی رال کبھی سرد نہ پڑنے والی آتشِ حرص کی خبر دیتی ہے، دنیا پرست اور نفس پرست انسان جب ایمان کی رسی تڑا کر بھاگتا اور نفس کی اندھی خواہشوں کے قبضہ میں اپنی لگام اور باگ دیدیتا ہے تو وہ پھر کتے کی حالت کو پہونچے بغیر دَم نہیں لیتا، وہ ہمہ تن شکم اور ہمہ تن شرمگاہ ہوتا ہے۔ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعاً لِمَا جِئْتُ بِهٖ.

ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفس میری لائی ہوئی ہدایت کے تابع نہ ہوجائے۔

مطلب یہ ہے کہ تمام تر طبعی میلانات وقلبی رجحانات تعلیمات وہدایاتِ نبوت کے زیرِفرمان ہوجائیں تبھی ایمان کی روح، برکت، فیض، قوت اور نور حاصل ہوسکتا ہے، ہوائے نفس کو ہدائے نبوت کے تابع کیا جائے تبھی ایمان کا نور حاصل ہوتا ہے، حضرت علی کرم اللہ

وجہہ نے فرمایا:

''مجھے تم پر بس دو چیزوں کا خطرہ ہے، ایک تو دور دراز کی امیدیں اور توقعات، دوسری خواہش پرستی۔

اللہ نے صاف حکم دیا کہ:

لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، إِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ. (ص: ٢٦)

ترجمہ: تم خواہشِ نفس کی پیروی مت کرو کہ وہ تم کو اللہ راہ سے بھٹکا دے گی، جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً اُن کے لئے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔

معصوم بچوں کو ظلم سے بچایئے!

بازاروں، ہوٹلوں، چائے خانوں، کارخانوں اور منڈیوں میں ہر طرف کمسن بچوں کا جو ہجوم مزدوری کرتا ہے، بوجھ لادتا ہے، برتن صاف کرتا ہے، پر مشقت کام کرتا ہے، عام طور پر اپنے خاندانی حالات سے مجبور ہو کر اسے یہ اقدام کرنا پڑتا ہے، حقوق انسانی کے علمبردار اداروں کی نگاہ شاید ان معصوم بچوں کے مستقبل کی تعمیر اور تربیت و تعلیم کے لئے ان کی مالی کفالت کی ذمہ داری سنبھالنے پر نہیں پڑتی، ایک بڑا اہم سبب معصوم بچوں کی اس مشغولیت کا ہوٹلوں اور کارخانوں وغیرہ کے وہ مالکان بھی ہیں جو کمسن بچوں سے کم تنخواہ پر طاقت سے زیادہ کام لے کر استحصال و ظلم کرتے ہیں۔

ظلم و تشدد کا اثر ان کے مستقبل پر کیا پڑتا ہے اس کا حال کسی سے بھی مخفی نہیں ہے، اصحابِ ثروت کا طبقہ ہی درحقیقت ان معصوم بچوں کی تخریبی تربیت کا ضامن ہوتا ہے، ان بچوں کے ساتھ ان کے بے رحمانہ سلوک، نامنصفانہ رویہ، پر تشدد انداز ہی مستقبل میں ان بچوں کو مجرمانہ زندگی پر آمادہ کرتا ہے۔

عہد طفولیت صالح ذہنی تعمیر و تربیت کے لئے خشتِ اول کا کام کرتا ہے جو اگر کج رہ جائے تو پوری دیوار کج ہی رہتی ہے:۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

علم النفس کے ماہرین نے اس اصول کو بہت اہم قرار دیا ہے کہ بچوں کی تربیت و تعلیم

وتلقین کے لئے تدریج سے کام لیا جائے، مناسب ماحول مہیا کیا جائے، ان سے مایوس نہ ہوا جائے، ترغیب وتشویق کے پہلو کو زیادہ اہمیت دی جائے اور سلبی پہلو اور تشدد سے آخری حد تک گریز کیا جائے، تشدد اور سلبی پہلو کا اثر بچوں کی نفسیاتی صحت، عقلی، لسانی، جذباتی اور جسمانی نشو ونما پر بہت گہرا پڑتا ہے۔

اب اگر بچپن کے اس دور میں جو فارغ البالی اور صالح تربیت حاصل کرنے کا دور ہوتا ہے بچہ کو کام میں لگا دیا جائے، پرتشدد اور سلبی رویّہ اختیار کیا جائے تو اس کے نفسیاتی دور رس و دیرپا اثرات آئندہ کی انفرادی واجتماعی زندگی پر نمایاں ہوتے ہیں، اور اس وقت ان پر کنٹرول بے حد مشکل ثابت ہوتا ہے۔

ظلم وتشدد بچہ کے دل میں معاشرتی اقدار سے بغاوت کا تخم ڈال دیتا ہے، پھر وہ خیر کی راہ سے ہٹ کر شر کی راہوں کو چن لیتا ہے، سلبی رویہ اسے تخریبی کاموں میں مشغول کر دیتا ہے۔

ظالم وجابر باپ، سخت وتنگدل اور بے رحم استاذ، جفا شعار وستم پیشہ مالک وذمہ دار کے سلبی پرتشدد روّیوں کے پس منظر میں اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو عہدِ طفولیت کے پرتشدد سلبی سلوک اور غلط کج تربیت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

جو غلط فکر افراد آج کے بچوں کے ساتھ ظالمانہ، وحشیانہ اور نامنصفانہ سلوک روا رکھتے ہیں وہ شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ یہی بچے کل بڑے ہو کر اس کا جواب اس سے زیادہ تشدد سے دیں گے، اور پھر وہ معاشرہ کا سکون غارت کریں گے، سلیقہ وتہذیب سے اپنی محرومی کا انتقام وہ معاشرہ کو اطمینان سے محروم کر کے لیں گے، انہیں ان کے اپنے حقوق سے محروم کیا گیا تھا اب وہ دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کریں گے، وہ ہر چیز پر حملہ آور ہوں گے، پھر نہ انہیں قانون روک سکے گا اور نہ مذہب اور نہ قید وبند، اس لئے کہ وہ قانون کے احترام سے نا آشنا، دین سے نابلد اور قید وبند چشیدہ ہیں۔

مستقبل کے مجرموں، دہشت گردوں کو آج کے محروم بچوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے، ان بچوں کی محرومی دور کرنے، ان پر سے ظلم کا ازالہ کرنے ہی سے جرم ودہشت گردی کا انسداد ممکن ہے۔

اصل جرم وظلم وشر کا سر چشمہ اور بنیادی سبب وہ لوگ ہیں جوان بچوں پر ظلم کرتے ہیں خواہ اپنی طاقت کے نشہ میں یا دولت کے نشہ میں، اس لحاظ سے آج کے مظلوم بے قصور بچوں کے آنسوؤں کو بے مایہ نہ سمجھا جانا چاہئے، ورنہ یہ آنسو رفتہ رفتہ سرکش و بے کنار طوفان کی شکل اختیار کر جائیں گے جن کے آگے بند باندھنا بے حد مشکل ہو جائے گا۔

نفس کے گناہ اور ان سے بچاؤ!

قرآن کریم میں واضح فرمایا گیا ہے کہ:

إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ، إِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (یوسف: ۵۳)

ترجمہ: نفس بدی پر اکساتا ہے الّا یہ کہ اللہ کی رحمت ہو، بیشک اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔

قرآن کی اس وضاحت سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر نفس کو لگام نہ دی جائے تو وہ برائی کی ظلمت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور نتیجہ کے طور پر رحمتِ الٰہی سے دور ہوتا جاتا ہے، انسان کے نفس میں جو وساوس اور برے خیالات آتے ہیں وہ اسکے ایمان اور تقویٰ کے لئے بیحد ضرررساں ثابت ہوتے ہیں، احکام الٰہی کی ہر مخالفت نفس کی اتباع کی کوکھ سے جنم لیتی ہے، اسی کو قرآن یوں بیان کرتا ہے کہ:

مَا أَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ، وَمَآ أَصَابَکَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ. (النساء: ۷۹)

ترجمہ: اے انسان! تجھے جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے، اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب وعمل کی بدولت ہے۔

اہلِ نفاق ہر دور میں نفس پرست ہوتے ہیں، اور یہی نفس پرستی ان کو گمراہی کی دلدل میں پھنسا دیتی ہے اور قبولِ حق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے، غزوۂ احد کے موقعے پر سخت

آزمائش کا موقعہ تھا، اس موقعے پر اہل نفاق کا حال قرآن یوں بتاتا ہے کہ:

وَطَآئِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ. (آل عمران: ١٥٤)

ترجمہ: ایک گروہ جس کے لئے (دین کے بجائے) ساری اہمیت بس اپنے نفس وذات کی تھی، اللہ کے متعلق جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلافِ حق تھا۔

نفس کے روگ بے شمار ہیں جن کا یہاں احاطہ نہیں ہوسکتا، چند نمایاں بیماریوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) سستی اور بزدلی:

سستی غفلت پیدا کرتی ہے، ہمت وعزم کو مارڈالتی ہے، اور انسان کو پست وذلیل کردیتی ہے، اپنے قولی وعملی فرائض کی ادائیگی سے سستی برتنے والا انسان بے عزت اور بدنام ہوجاتا ہے، یہ روگ جس کو لگ جاتا ہے اس کے ساتھ بدنامی کا بدنما داغ ضرور لگ جاتا ہے، یہی حال بزدلی کا ہے، حکماء کے بقول بزدلی ایمان کے منافی ہے، بزدل آدمی جہاد فی سبیل اللہ کی عظیم ترین عبادت سے محروم رہتا ہے۔

(۲) کینہ اور بغض:

یہ بہت بڑے نفسانی روگ ہیں، یہ اَنا پرستی اور دوسروں سے لاتعلقی کی واضح علامت ہوتے ہیں، ایمان اسی وقت معتبر ہوتا ہے جب آدمی کا دل ونفس کینہ، کھوٹ اور کپٹ سے خالی ہو، اس کے بغیر حصولِ جنت ناممکن ہے۔

(۳) حرص وطمع:

لالچ اور حرص انسان کا بہت بڑا عیب ہے، اس کا تعلق بھی نفس وقلب سے ہے، سچا

مؤمن اس روگ اور مرض سے دور رہتا ہے، حرص کو اہل کفر ونفاق کی علامت بتایا گیا ہے۔

نفس کو برائیوں سے بچانے اور بھلائیوں کی طرف راغب بنانے کے مختلف طریقے ہیں، ان میں سے پہلا طریقہ صبر کا ہے، صبر نفس کو سنوارنے اور اس کو اخلاقِ عالیہ سے آراستہ کرنے کا اہم ذریعہ ہے، دوسرا طریقہ مراقبہ کا ہے یعنی خفیہ وعلانیہ بہر حال اللہ کی طرف دھیان رہے، اس سے نفس پر قابو ملے گا، اور وہ گناہ کے لئے آزاد نہ رہے گا۔

ایک آدمی حضرت ابراہیم بن ادہم کے پاس آیا اور کہا کہ میں بہت گنہ گار ہوں، کوئی ایسا طریقہ بتادیجئے کہ میرا نفس گناہ کی طرف مائل نہ ہو، ابراہیم بن ادہم نے فرمایا کہ اگر تم پانچ کام کرلو تو کوئی گناہ تم کو نقصان نہیں پہنچائے گا:

(۱) جب تم گناہ کا ارادہ کرو تو اللہ کا رزق نہ کھاؤ، اس آدمی نے پوچھا کہ پوری روئے زمین پر اللہ ہی کا رزق ہے تو میں کہاں سے کھاؤں؟ ابراہیم نے فرمایا کہ کیا یہ مناسب ہے کہ تم اللہ کا رزق کھاؤ اور پھر اسی کی نافرمانی کرو۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ جب تم گناہ کا ارادہ کرو تو اللہ کی زمین پر نہ رہو، اس آدمی نے پوچھا کہ پوری زمین اللہ ہی کی ہے تو پھر میں کہاں رہوں؟ ابراہیم نے فرمایا کہ کیا یہ مناسب ہے کہ تم اللہ کا رزق کھاؤ اور اس کی زمین میں رہو اور پھر اس کی معصیت کرو۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ اگر تم گناہ کا ارادہ کرو جب کہ تم اللہ کی زمین پر اللہ کا رزق استعمال کر رہے ہو تو اتنا کرو کہ ایسی جگہ ڈھونڈ لو جہاں اللہ تم کو نہ دیکھ سکے، اس آدمی نے کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اللہ تو سب جگہ ہے اور سب کچھ جانتا ہے، ابراہیم نے فرمایا کہ کیا یہ مناسب ہے کہ تم اللہ کی زمین میں اس کا رزق استعمال کرتے ہوئے اس کی نافرمانی کرو جب کہ وہ تم کو دیکھ بھی رہا ہو اور تمہارا گناہ اس کے علم میں بھی ہو۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ جب ملک الموت تمہاری روح قبض کرنے آئے تو اس

سے توبہ اور عمل صالح کی مہلت مانگ لو، اس آدمی نے کہا کہ وہ مہلت کب دے گا؟ ابراہیم نے فرمایا کہ جب تم جانتے ہو کہ موت کا وقت آنے پر نہ وہ ٹل سکتی ہے اور نہ تم کو مہلت مل سکتی ہے پھر کیسے مناسب ہے کہ تم گناہ کرو۔

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ جب قیامت میں ملائکۂ جہنم تمہیں جہنم کی طرف لے جائیں تو تم ان کے ساتھ نہ جانا، اس آدمی نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہاں تو میں مجبور ہوں گا، ابراہیم نے کہا کہ پھر تم گناہ کے ساتھ نجات کیسے پاسکتے ہو، اس پر اس آدمی نے کہا کہ اتنا میرے لئے بس ہے، میں سب گناہوں سے دامن کش ہوتا ہوں۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ گناہوں سے بچاؤ کے لئے مقامِ صبر اور مقامِ مراقبہ کے حصول کی کتنی اہمیت ہے۔

اجتماعیت کی روح

اسلام کا مزاج اور پیغام یہ ہے کہ وہ اجتماعیت، اتحاد اور اجتماعی ربط و جوڑ کو انتشار، تعصب، اور باہمی توڑ کے مقابلے میں پسند کرتا ہے، وہ انفرادی فکر کے مقابلے میں اجتماعی فکر پیدا کرنا چاہتا ہے، اس میں ذاتی مقاصد کی تکمیل کے بجائے اجتماعی مقاصد کی تکمیل کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

جاہلیت اور اسلام کا ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ جاہلیت میں قبیلہ بندی کا رواج تھا، ہر بجا و بیجا اور جائز و ناجائز میں اپنے خاندان کی تائید اور مدد ضروری امر سمجھا جاتا تھا، مگر اسلام نے قبیلہ بندی کا رجحان ختم کر کے حق پسندی اور عدل کی تعلیم دی، ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی قرار دیا، اور ہر طرح کے ظلم اور ناانصافی کو بہت بڑا جرم قرار دیا، مظلوم کی مدد یہ بتائی کہ اسے بچایا جائے اور ظالم کی مدد یہ بتائی کہ اسے ظلم سے روکا جائے۔

تعصب کو اسلام بہت بڑا گناہ بتاتا ہے، ارشادِ نبوی ہے:

مَنْ دَعَا إِلىٰ عَصَبِيَّةٍ فَلَيْسَ مِنَّا، وَمَنْ قَاتَلَ عَلىٰ عَصَبِيَّةٍ فَلَيْسَ مِنَّا، وَمَنْ مَاتَ عَلىٰ عَصَبِيَّةٍ فَلَيْسَ مِنَّا. (ابو داؤد شریف)

ترجمہ: جو تعصب کی دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں ہے، جو تعصب سے لڑے وہ ہم میں سے نہیں ہے، جو تعصب پر مَرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ تعصب کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ: ''تعصب ظلم پر اپنے بھائی کی مدد کا نام ہے''۔ (ابوداؤد)

فرمایا گیا کہ اجتماعیت رحمت ہے اور انتشار عذاب ہے، اجتماعیت میں برکت ہے اور انتشار میں بے برکتی ہے، جماعت کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے، انتشار میں شیطان کی مسرت اور معیت ہوتی ہے، جنت کا حصول اجتماعیت پر موقوف ہے، اسی لئے اسلام میں اجتماعیت کی بے حد اہمیت آئی ہے اور ہر فردِ بشر میں اجتماعی روح پیدا کرنے کی مکمل کوشش کی گئی ہے، اور اجتماعی تقاضوں کو انفرادی تقاضوں سے مقدم رکھنے کی بیحد تاکید کی گئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ:

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ، یَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضاً. (متفق علیه)

ترجمہ: ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے عمارت کی طرح ہوتا ہے، جس طرح عمارت کا ایک حصہ دوسرے حصے کی مضبوطی کا ذریعہ ہوتا ہے اسی طرح ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی قوت اور سہارا ثابت ہوتا ہے۔

اسلامی تعلیمات واحکام کا تجزیہ بھی یہی بتاتا ہے کہ اجتماعی روح پھونکنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اور انفرادی تقاضوں کو پس پشت ڈالنے کی تاکید کی گئی ہے، نماز کے باب میں جماعت کی تاکید، اہمیت، ترکِ جماعت پر سخت وعیدیں، اذان کا اہتمام، مساجد کی اہمیت وتقدس، عیدین کا نظام سب کچھ اس کا واضح ثبوت ہے، ایک نابینا صحابی کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تنہا نماز پڑھنے اور جماعت میں شریک نہ ہونے کی اجازت نہ دی، اور یہ ارادہ فرمایا کہ جماعت میں بلا عذر نہ آنے والوں کو گھروں کے ساتھ جلادیں، نماز باجماعت کی صفیں لگی ہوں اور کوئی پیچھے اکیلا نماز پڑھ رہا ہو اگرچہ جماعت میں شریک ہو اس کو بھی ناپسند فرمایا کہ یہ اجتماعی نظام کے خلاف ہے، حضرت وابصہ بن معبدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اس کو نماز دہرانے کا حکم دیدیا۔ (ترمذی شریف)

شرعی مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی آدمی مسجد میں آئے اور صفیں پُر پائے، اور پیچھے تنہا

کھڑے ہونے کے سوا کوئی اور چارہ نہ ہو تو آگے سے نرمی سے کسی نمازی کو پیچھے اپنے ساتھ کر کے اس کے ساتھ نماز پڑھے، اور جسے پیچھے کیا جائے وہ ضرورت سمجھ کر خوش اسلوبی سے پیچھے آجائے، اس عمل کو باعثِ اجر بتایا گیا ہے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام ظاہری وباطنی ہر اعتبار سے وحدت واجتماعیت کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔

مسلمان نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتا ہے اور اپنے مالک سے یہ دعا کرتا ہے کہ:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ.

ترجمہ: ہم کو سیدھا راستہ دکھا دیجئے۔

یہاں بھی اجتماعی دعا ہے، وہ صرف اپنے لئے نہیں بلکہ سب کے لئے اللہ سے ہدایت کی دعا مانگتا ہے، رمضان میں مسلمان تنہا نہیں سب کے ساتھ مل کر روزہ رکھتا ہے، عید کے دن تنہا نہیں سب کے ساتھ مل کر روزہ توڑتا ہے، اگر اس نے تنہا رمضان کا چاند دیکھا ہے اور کسی نے نہیں دیکھا، اور اگلے دن سب بے روزہ ہیں تو اسے بھی بے روزہ رہنا ہے، اگر اس نے تنہا عید کا چاند دیکھا ہے اور کسی نے نہیں دیکھا، اور اگلے دن سب روزے سے ہیں تو اسے بھی روزے سے رہنا ہے، کسی بھی طرح جماعت سے الگ نہیں ہونا ہے، اسی کو ایک حدیث میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

"روزہ اسی دن ہوگا جب سب لوگ روزہ رکھیں، اور عید اسی دن ہوگی جب سب لوگ عید منائیں"۔ (ابوداؤد شریف)

ان مسائل فقہیہ میں ائمہ کے جزوی اختلافات تو ہیں مگر اس حقیقت کا ادراک بہر صورت کیا جاسکتا ہے کہ اسلام اپنی ہر تعلیم اور ہر حکم کے ذریعہ اپنے متبعین میں اجتماعیت کی روح پیدا کرنا اور انفرادیت کی فکر ختم کرنا چاہتا ہے، واقعہ بھی یہی ہے کہ ہر مرحلۂ زندگی میں ملت کا مفاد اجتماعیت ہی سے وابستہ ہے۔

اجتماعیت

ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے جو تعلق اور رشتہ ہوتا ہے وہ فی الواقع اخوت، مودت، وفاداری اور اخلاص کی ناقابل شکست بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، ایمان کامل اس تعلق کی مضبوطی، استحکام اور جماؤ میں سب سے زیادہ مؤثر عنصر ثابت ہوتا ہے، ایک مسلمان جب یہ حقیقت اپنے دل میں بٹھالیتا ہے کہ تمام مسلمان رنگ ونسل، حسب ونسب، زبان وکلچر، اور وطن ومکان کی حدود وقیود سے بلند ہوکر ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور ایک ہی نظام سے مربوط ہیں تو پھر وہ اپنے تمام اعمال ومعاملات اور برتاؤ میں اس حدیث کو بنیاد بناتا ہے کہ ''جو اپنے لئے پسند کرو وہی اپنے بھائی کے لئے پسند کرو اور جو اپنے لئے ناپسند کرو وہی اپنے بھائی کے لئے ناپسند کرو'' اور وہ ہر آن قرآنی اور نبوی ہدایات کو پیش نظر رکھتا ہے، چنانچہ وہ ہر جائز موقع پر اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے، بے یار ومددگار نہیں چھوڑتا، اچھا گمان رکھتا ہے، بدگمانی، غیبت، تجسس اور حسد وچغلی وغیرہ سے حتی الامکان بچتا ہے۔

خداوند قدوس نے اہل ایمان کو جابجا اس کا حکم دیا ہے کہ وہ انسانی حقوق پامال کرنے کا جرم ہرگز نہ کریں، اور نہ ہی انسانی کرامت اور آبرو پر حملہ کریں، یہ بھی واضح فرمایا گیا ہے کہ اہل ایمان کے باہمی تعلقات کو سب سے بڑا خطرہ غیبت سے ہوتا ہے، غیبت کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے بھائی کے واقعی عیب کو اس کی عدم موجودگی میں اس طرح بیان کیا جائے کہ اگر وہ سن لے تو ناگواری کا اظہار کرے، اور اگر وہ عیب اس میں نہ ہو پھر بھی اس کی طرف منسوب کردیا جائے تو یہ بہتان ہے۔

ایک حدیث میں وارد ہوتا ہے کہ:

''ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا غیبت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ'' کہ تو کسی شخص کا ذکر اس طرح کرے کہ وہ سنے تو اسے ناگوار ہو۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر چہ میری بات حق ہو؟ آپ نے جواب دیا اگر تیری بات باطل ہو تب تو یہ بہتان ہے''۔ (مؤطا امام مالک)

احادیث میں بہت صاف فرمادیا گیا ہے کہ:

''بدترین بہتان کسی مسلمان کی عزت پر ناحق حملہ کرنا ہے''۔ (ابوداؤد)

قرآن کریم کی سورۂ حجرات میں اہل ایمان کو ان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں فساد برپا کرنے والی برائیوں سے بچنے کی بڑے بلیغ اسلوب میں تاکید فرمائی گئی ہے، ان میں تمسخر اور استہزاء، طعنہ زنی، برے القاب سے پکارنے، بدگمانی، پوشیدہ عیب کا سراغ لگانے اور غیبت کا نام بہ نام ذکر کر کے ان کی شناعت ظاہر کی گئی ہے۔

حجۃ الوداع کے خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بڑی خصوصیت سے فرمائی تھی کہ مسلمان کا خون مال اور آبرو تینوں محترم ہیں اور ان میں سے کسی پر بھی کسی نوع کا حملہ ناروا ہے۔

اجتماعی زندگی کے لئے حسد اور بغض بھی سمّ قاتل ثابت ہوتے ہیں، ایک حدیث میں فرمایا گیا:

''تمہاری طرف بھی پہلی قوموں کا مرض چپکے سے چل پڑا ہے، اور وہ حسد اور بغض ہے، یہ دین کو مونڈ دینے والی چیزیں ہیں''۔ (مسند احمد)

بلکہ اہل ایمان کو ان امور کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے جو باہمی تعلقات کو خوشگوار بنائیں اور اجتماعیت کی روح پیدا کریں، چنانچہ خوش گمانی، اپنے بھائی کی پردہ داری،

دفاع، جان ومال وآبرو کا تحفظ، جائز امور میں ہر ممکن مدد اور تعاون، حقوق کی پاسداری اور ادائیگی وغیرہ کا حکم فرمایا گیا ہے۔

اتحاد و اتفاق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور قوت کا واحد حل ہے اور یہ حل تمام امتوں اور مذاہب میں متفق علیہ رہا ہے، وحدت واتحاد کے لئے مرکز صرف اسلام وقرآن بن سکتا ہے اور باہمی اتحاد اطاعت الٰہی پر موقوف ہے، معاصی کے ساتھ یہ انعام نہیں ملتا۔اس اصول کو حرزِ جاں بنائے رکھنا چاہیئے۔

نیکیوں کا زہر: حسد

کسی بندۂ خدا کو حاصل شدہ دینی، علمی، عملی، مالی، بدنی وجسمانی، اخلاقی وروحانی نعمتوں کے زوال اور خاتمہ کی تمنا کا نام شریعت کی اصطلاح میں حسد ہے۔

حسد بدترین اخلاقی مرض ہے، انسانی زندگی کی قبیح ترین خصلت ہے، اسی لئے قرآن وحدیث کے نصوص میں اس کی بے پناہ مذمت اور اس سے دور رہنے کی تلقین وتاکید آئی ہے، عہد رسالت میں اللہ عزوجل نے اہل ایمان کو قرآن وایمان کی جو بے بہا دولت ونعمت عطا فرمائی تھی بدباطن یہودی اس سے جلتے تھے اور ان کے دلوں میں ہمہ وقت یہی تمنا اور آرزو مچلتی رہتی تھی کہ یہ نعمت مسلمانوں سے سلب کرلی جائے۔ قرآن کی صراحت ہے کہ:

وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِكُمْ كُفَّاراً، حَسَداً مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ. (البقرة: ۱۰۹)

ترجمہ: اہل کتاب میں سے اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر پھر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں، اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے، مگر اپنے نفس کے حسد کی بنا پر تمہارے لئے ان کی یہ خواہش ہے۔

حسد کے مختلف درجات ہیں، ایک درجہ یہ ہے کہ صرف صاحب نعمت سے سلب نعمت کی تمنا دل میں ہو، خواہ خود اس تمنا کرنے والے کو وہ نعمت میسر آئے یا نہ آئے، حسد کی سب سے بدترین صورت یہی ہے، اہل نفاق اسی حسد میں مبتلا تھے کہ وہ اہل ایمان سے نعمت ایمان سلب کئے جانے کے متمنی تھے اور انہیں اپنی طرح کافر دیکھنا چاہتے تھے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی دوسرے کو حاصل شدہ نعمت کے بارے میں یہ تمنا کرے کہ یہ نعمت مجھے مل جائے، لیکن چونکہ یہ نعمت اسے دوسرے سے سلب کئے جائے بغیر مل نہیں سکتی ہے اس لئے ضمناً اس کی یہ آرزو بھی ہوتی ہے کہ صاحب نعمت سے یہ نعمت سلب کرلی جائے، یہ صورت بھی قابل مذمت ہے، ہاں اگر صاحب نعمت سے سلب نعمت کی تمنا نہ ہو بلکہ اس جیسی نعمت خود حاصل ہونے کی آرزو ہو تو یہ بالکل معیوب نہیں ہے بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے۔

حسد کے اسباب ومحرکات کا تجزیہ واضح کرتا ہے کہ اس میں مختلف امور کارفرما ہوتے ہیں، سب سے بنیادی سبب بغض وعداوت ہے، اکثر دوسرے سے جذبۂ عداوت ہی حسد کی راہ ہموار کرتا ہے اور علماء نے لکھا ہے کہ بغض وعداوت کی وجہ سے پیدا ہونے والا حسد عام ہوتا ہے، اس میں مساوات کی قید نہیں بلکہ ایک ادنیٰ شخص اعلیٰ سے اعلیٰ شخص کا بدخواہ ہوسکتا ہے، تعلیمی میدانوں میں تجربات رکھنے والے افراد کے سامنے بغض وعداوت کے نتیجے میں پیدا شدہ حسد کے نمونے اور مظاہر جا بجا آتے ہیں، کچھ نہ جاننے والے افراد عموماً ہمہ دانی کے مدعی اور جہل مرکب میں مبتلا ہوکر واقعتاً علمی صلاحیتوں سے مالا مال قابل رشک وفخر اور لائق احترام وقدر افراد سے حسد کرنے لگتے ہیں اور ان کی علمی ترقی میں حائل ہونے لگتے ہیں۔

حسد کا ایک سبب جاہ پرستی ہے، یہود کو اہل اسلام سے اس بنیاد پر بھی حسد تھا کہ وہ اہل اسلام کو اپنے اقتدار کی راہ کا روڑا سمجھ رہے تھے، آج بھی مختلف شعبہائے حیات میں اس کے نمونے ملتے ہیں، حسد کے دیگر اسباب کبر، تعلّی، ذاتی فخر کا خیالی تصور، خبث باطن، بدطینتی وغیرہ آتے ہیں۔

کسی عالم سے پوچھا گیا کہ فلاں صاحب آپ سے ناراض رہتے ہیں اور آپ کی مذمت کرتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ میرے سگے رشتہ دار ہیں، پڑوسی بھی ہیں اور ہم پیشہ بھی ہیں، یعنی قرابت، ہمسائیگی اور ہم پیشگی یہ سب اسباب حسد بن جاتے ہیں۔

فقیہ ابواللیث سمرقندی کا مقولہ ہے:

''حسد کے اثرات محسود (جس سے حسد کیا جائے) تک پہنچنے سے پہلے ہی حاسد کو پانچ سزائیں مل جاتی ہیں، ایک تو دائمی غم وفکر، دوسرے بے فیض مصیبت، تیسرے عیب ومذمت، چوتھے اللہ کی ناراضگی اور پانچویں اللہ کی جانب سے بے توفیقی''۔

اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسد سے اجتناب کی بہت سخت اسلوب میں تاکید فرمائی ہے۔ایک حدیث میں آیا ہے:

اِتَّقُوْا الْحَسَدَ، فَإِنَّ الْحَسَدَ يَأْكُلُ الْحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ. (سنن ابو داؤد شریف)

ترجمہ: تم لوگ حسد سے بچو، کیونکہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ:

''ہر شخص کو خوش کرنا ممکن ہے، لیکن حاسد کو خوش نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ اس کی خوشی تو نعمت کے زوال ہی سے ہوتی ہے''۔

حسد ایسا گناہ ہے جو متعدد گناہوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے، حاسد نفاق پیشہ ہوتا ہے، اسے قطع رحمی کرنی پڑتی ہے، وہ بہتان طرازی اور افترا پردازی کرتا ہے، وہ دوسرے مسلمان کو حقیر سمجھنے کا مجرم ہوتا ہے، وہ دنیا کی محبت میں جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے، وہ دروغ گوئی، غیبت، افشائے راز، پردہ دری، استہزاء، تجسس اور ایذاء مسلم جیسے قطعی حرام امور کا مرتکب ہوتا ہے۔

محسود (جس سے حسد کیا جائے) کے لئے شریعت کا حکم یہ ہے کہ وہ حاسد کے شر سے پناہ مانگتا رہے، اللہ کی طرف رجوع ہو، گناہوں سے تائب ہو، اللہ پر کلی اعتماد وتوکل کرے، حاسد کی بدگوئیوں پر صابر رہے اور حسب موقع اس کو سمجھائے۔

حاسد کو شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ وہ حسد سے دور رہے، اخلاص کے ساتھ توبہ کرے، اپنے سے کمتر کو دیکھ کر شکر کرے، دعا کرتا رہے، سلام کا اہتمام کرے، قرآن غور سے پڑھے اور راہِ خدا میں صدقہ دے، اپنے پاس موجود چیز پر قانع رہے۔ حدیث میں آیا ہے:

''جب تمہیں مالی و علمی اعتبار سے اپنا برتر نظر آئے تو اپنے سے کمتر کو دیکھو''۔ (بخاری شریف)

اور ایک حدیث میں حسد سے نجات کا یہ طریقہ بیان ہوا ہے کہ:

''جب حسد ہو جائے تو حسد پر عمل نہ کرو اور حد سے نہ گزرو''۔

حسد اخوت اسلامی کے شیرازے کو منتشر کر دیتا ہے اسی لئے اس سے پوری طرح بچنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے نہ بچنے والوں کو لعنت کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

نوجوانوں میں صحیح شعور پیدا کرنے کی ضرورت

کہا جاتا ہے اور بالکل صحیح کہا جاتا ہے کہ نوجوان کسی بھی قوم کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں، قوموں کا مستقبل ان سے وابستہ ہوتا ہے، انقلابات ان کے دم سے آتے ہیں، علمی سرگرمیاں بیشتر ان ہی کی ہوتی ہیں، اسلام چونکہ آفاقی اور عالمی مذہب ہے، اس لئے وہ نوجوانوں کو خاص اہمیت دیتا ہے، ایک حدیث میں جوانی کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ:

اِغْتَنِمْ خَمْساً قَبْلَ خَمْسٍ، حَیَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ، وَفَرَاغَکَ قَبْلَ شُغْلِکَ، وَغِنَاکَ قَبْلَ فَقْرِکَ، وَشَبَابَکَ قَبْلَ هَرَمِکَ، وَصِحَّتَکَ قَبْلَ مَرَضِکَ. (مشکاۃ المصابیح)

ترجمہ: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو، زندگی کو موت سے پہلے، فراغت کو مشغولیت سے پہلے، مالداری کو محتاجی سے پہلے، جوانی کو بڑھاپے سے پہلے اور صحت کو بیماری سے پہلے۔

دوسری حدیث میں فرمایا گیا کہ:

"قیامت کے روز ہر فرزند آدم سے کچھ سوالات ضرور ہوں گے، عمر وزندگی کے بارے میں سوال ہوگا کہ کس کام میں گزاری اور صرف کی؟ جوانی کے قیمتی لمحات کیسے گزارے؟ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ علم کے مطابق عمل کیا یا نہیں؟"۔

اسلام تمام انسانوں خصوصاً نوجوانوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ وہ ایمانی رسوخ پیدا کریں، کفر وفسق اور عصیان وطغیان سے گریزاں ہوں، طاعات کی طرف راغب ہوں، بلکہ اسلام کہتا ہے کہ طاعات الٰہیہ میں منہمک نوجوان قیامت کے روز عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوگا جہاں اس کے سوا کوئی اور سایہ میسر نہ آئے گا۔

تاریخ کی شہادت یہی ہے کہ اصلاح وصلاح کی تمام تر تحریکات، کوششوں اور سرگرمیوں میں نوجوانوں کا رول سب سے اہم اور نمایاں رہتا ہے، سیدنا ابراہیم خلیل اللہ نے نوجوانی ہی میں اپنی قوم کے برے عقائد، بت پرستی، اصنام تراشی، گمراہی اور بدکرداری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا اور بتوں کو پاش پاش کرنے کے بعد قوم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ حقیقت واضح کی تھی کہ:

أَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ شَيْئًا وَّلَا يَضُرُّكُمْ، أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ، أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. (الانبياء: ٦٦)

ترجمہ: یہ وہ بت ہیں جن میں نہ نفع پہنچانے کی صلاحیت ہے اور نہ ضرررسانی کی، تم پر تُف ہو اور تمہارے ان ہاتھوں سے تراشے ہوئے بے جان معبودوں پر تُف ہو، تم عقل سے محروم ہو۔

حق گوئی کی سزا ان کو آگ کے الاؤ میں ڈال کر دی گئی، مگر ان کے صبر واستقامت میں ذرا بھی کمی نہ آئی اور پھر اللہ کے حکم سے وہ مشتعل آگ ان کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی بن گئی۔

سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کے بارے میں ان کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا تھا کہ ان کو وہ ذبح کررہے ہیں، یہ خدا کا حکم تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام نوجوان تھے، مگر ان کے دل میں اطاعتِ الٰہی کا جذبہ موجزن تھا، انہوں نے خود حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ابا جان:

يَآ أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ.

(الصافات: ۱۰۲)

ترجمہ: آپ حکم الٰہی کی تعمیل کیجئے، آپ انشاء اللہ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے۔

اطاعت وقربانی کی یہ مثال تاریخ عالم کی منفرد مثال ہے۔

حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہما السلام پر سب سے پہلے ایمان لائے، اس وقت وہ نوجوان تھے، پھر نبی بھی بنائے گئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو عین عنفوان شباب میں مختلف مصائب ومحن سے گزرنا پڑا، قید وبند کی صعوبتوں سے سابقہ پیش آیا، مگر ان کا صبر وثبات بے نظیر تھا، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی نعمتوں سے دنیا میں بھی سرفراز فرمایا، ملک کے خزانے ان کے سپرد کردیئے گئے۔

سورۂ کہف میں جن اہل حق کے ثبات ایمانی اور رسوخِ دینی کا ذکر ہے وہ قرآن کے بقول:

إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدىً، وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ إِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، لَنْ نَّدْعُوَ مِنْ دُوْنِهٖ إِلٰهاً.

(الکھف: ۱۳-۱۴)

ترجمہ: چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخش دی تھی، ہم نے ان کے دل اس وقت مضبوط کردیئے جب وہ اٹھے اور انھوں نے یہ اعلان کردیا کہ ہمارا رب تو بس وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے، ہم اسے چھوڑ کر کسی دوسرے معبود کو نہ پکاریں گے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پوری جوانی صبر وعزیمت کے کارناموں سے لبریز ہے،

ہجرت کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے باہر دشمنوں کا قافلہ موجود تھا کہ آپ کے نکلتے ہی نعوذ باللہ کام تمام کر دیا جائے، مگر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ تم میری چادر اوڑھ کر میرے بستر پر سو جاؤ، میں تمہارے لئے جنت کی ضمانت لیتا ہوں، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان، میں ہمہ تن آمادہ ہوں، پھر حضرت علیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر سوئے اور چند دنوں بعد قبا میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے آملے، قرآن کریم کی اس آیت کے اولین مصداق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاةِ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ. (البقرة: ٢٠٧)

ترجمہ: کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتے ہیں، ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے۔

کوہِ صفا پر چڑھ کر توحید و رسالت کی تصدیق کی جو دعوت اور پیغام آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مکہ والوں کو دیا تھا اور اس کا ردّ عمل انکار، لعن طعن اور بدگوئی کی شکل میں سامنے آیا تھا، پورے مجمع میں صرف حضرت علیؓ تھے جنھوں نے اس پیغام کو بے چون و چرا قبول کر لیا تھا اور پھر یہی ان کے رگ و پے میں پیوست اور اُن کے جسم کے ریشے ریشے میں سما گیا تھا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کی اخلاقی اور روحانی تربیت پر اولین توجہ فرمائی تھی، وہ ان میں اخلاص، اسلامیت، استقامت دینی کے ساتھ شجاعت، خطر پسندی اور عقیدہ وحق کی راہ میں ہر قربانی بے دریغ پیش کرنے کا جذبۂ بے تاب پیدا کرنے کی لئے ہمہ وقت کوشاں رہا کرتے تھے، نوجوان صحابی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اے لڑکے! اللہ کو یاد کرو، اللہ تم کو محفوظ رکھے گا، اللہ کی احکام کی پابندی کرو وہ ہمہ وقت تمہاری مدد کرے گا، جب بھی مدد مانگنا ہو اللہ سے مانگو، اللہ کے سوا کوئی لاکھ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے نہیں پہنچا سکتا“۔

قرنِ اول کے نوجوانوں کا فیض ہے کہ اسلام مشرق سے مغرب تک پھیلا، اس کی اذان گونجی، اس کا علم لہرایا اور لوگ دین اسلام میں فوج در فوج داخل ہوئے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوجوانوں کی صلاحیتوں کو کام میں لگایا، ان کو عسکری قیادت سونپی، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت علی بن ابی طالبؓ، حضرت مصعب بن عمیرؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ وہ نوجوان صحابہ کرام تھے جن کی قربانیوں سے اسلامی فتوحات وجود میں آئیں، حق کا پرچم بلند ہوا اور اسلام کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔

فاتح سندھ محمد بن قاسم ثقفی نے سترہ سال کی عمر میں سندھ فتح کیا اور اپنے حسن اخلاق سے دل بھی جیت لئے، ایسے نمونے تاریخ اسلام میں بے شمار ہیں۔

ہمارے موجودہ دور کا بہت بڑا المیہ نوجوانانِ ملت کی بے راہ روی اور صحیح شعور سے محرومی ہے، وہ اپنی ذمہ داریوں سے بے خبر اور غافل ہیں، انہیں جو کردار ادا کرنا ہے اور جو کام انجام دینا ہے اس سے ناواقف ہیں، موجودہ حالات میں امت کو جو خطرات لاحق ہیں اور اغیار کی طرف سے جو منظّم حملے ہو رہے ہیں ان کا اصل مقابلہ نوجوان ہی کر سکتے ہیں، ان کو بیدار ہونا پڑے گا، ان ہی کی جرأت وعزیمت سے مشکل مرحلے سَر ہو سکیں گے اور الجھی گتھیاں سلجھ سکیں گی۔

اخلاقی قوت ہی اصل جوہر ہے

ایک عرب شاعر نے بہت پتے کی بات کہی ہے کہ:

وَإِنَّمَا الْاُمَمُ الْاَخْلَاقُ مَا بَقِيَتْ

فَاِنْ هُمْ ذَهَبَتْ اَخْلَاقُهُمْ ذَهَبُوْا

امتیں اور اقوام اخلاق کی بدولت زندہ رہتی ہیں، اخلاق نہ رہیں تو امتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

امتوں کی حیات وبقاء کے لیے اخلاق کی اہمیت کلیدی نوع کی ہوتی ہے، اخلاق کی دولت سے محرومی زندگی کو بے روح و بے کیف بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند قدوس نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے اپنے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا تو انہیں خود اخلاق کا اعلیٰ مرتبہ عطا کیا اور ان کی تعلیمات میں اصلاح اخلاق کو بنیادی درجہ عطا کیا، قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کے سلسلہ میں فرمایا گیا:

إِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِيْمٍ. (القلم: ٤)

ترجمہ: بے شک آپ اخلاق کے اعلیٰ ترین درجہ پر ہیں۔

یوں تو دنیا کے تمام مذاہب کی اساس اخلاق ہی پر ہے، تمام انبیاء و مصلحین نے اخلاق کی تعلیم دی، لیکن اسلام میں اخلاق کو بیحد اہمیت دی گئی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا مقصد حسنِ اخلاق کی تکمیل بتایا ہے، خود قرآن کریم میں آپ کا ایک اہم مقصدِ بعثت تزکیہ (اصلاح اخلاق و تعمیر سیرت) قرار دیا گیا ہے، تمام مذاہب میں اسلام کو یہ

امتیاز حاصل ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو اتنی اخلاقی تعلیمات دے دی ہیں جو ان کو راہِ راست سے بھٹکنے سے روک دیں، یہی وجہ ہے کہ ان اخلاقی تعلیمات نے اصلاح کا وہ کام کیا ہے جو قوانین بھی نہ کر سکے۔

اسلام اس شعبے میں طبع انسانی کے ان نازک وباریک مسائل پر توجہ دیتا ہے جو اپنی نزاکت ولطافت کے باوجود حیات انسانی پر دیرپا اثر ڈالتے ہیں، فی الواقع انسان کی ظاہری زندگی کے اعمال اس کے باطنی اخلاق ہی کا پَرتو ہیں، اسی لیے اسلام نے ان کی اصلاح کو ہدف بنایا تاکہ باطن کے سدھار کے بعد ظاہر بھی درست ہو سکے، چنانچہ قرآن نے اعلان کر دیا کہ:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا، وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا. (الشمس: ۹-۱۰)

ترجمہ: جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور سنوارا وہ فلاح یاب ہو گیا اور جس نے اسے (گناہوں میں) دبا دیا وہ ناکام ہو گیا۔

اسلام نے جو عبادات فرض کی ہیں ان کا بھی ایک اہم مقصد اصلاح اخلاق ہے، نماز کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہ برائیوں و بے حیائیوں سے روکتی ہے، روزہ کا مقصد تقویٰ وشکر کی کیفیت پیدا کرنا بتایا گیا ہے، زکوۃ کے ذریعہ انسانیت کی ہمدردی و مدد کا سبق دیا جاتا ہے، اس لحاظ سے ہر عبادت کا اساسی مقصد اخلاق کی پاکیزگی ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے بعد اخلاقِ حسنہ کو سب سے زیادہ مقدم قرار دیا ہے، قرآن میں انہیں اہل ایمان کو فلاح یاب قرار دیا گیا ہے جو اپنے ایمان کے بعد اخلاق کی اصلاح کر لیں، مثلاً نماز میں خشوع، لغویت سے اجتناب، آبرو کی حفاظت، بے حیائی سے دوری، وعدہ ومعاہدہ کی پاس داری، امانتوں کی ادائیگی وغیرہ کی پابندی کریں، قرآن میں جا بجا اہل ایمان کے اوصاف میں اخلاق حسنہ کا ذکر آیا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا کتب حدیث میں آتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ:

''خدایا! مجھے بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی بہترین اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا''۔

احادیث میں بارہا حسن اخلاق کی اہمیت کا ذکر کیا گیا ہے، کہیں اسے کمال ایمان بتایا گیا ہے کہیں اسے قیام لیل اور دن کے روزوں کے مساوی قرار دیا گیا ہے اور کہیں اسے قیامت کے دن میزانِ عمل کی سب سے وزنی اور بھاری چیز کہا گیا ہے، کہیں اسے خدا ورسول کی محبت وقرب کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ کے اخلاق اختیار کرو، اس طرح اخلاق حسنہ کی تلقین کی گئی ہے، دراصل اخلاق حسنہ صفاتِ خداوندی کا پَرتو اور مَظہر ہیں اور اخلاق حسنہ ایمان کی تکمیل اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی صفات کاملہ کے ادنیٰ مظاہر ہیں، اقبال نے بھی یہی واضح کیا ہے کہ ایک مؤمن مختلف ومتضاد اخلاق وصفات کا حامل ہوتا ہے جو دراصل اللہ کی صفات واحوال کے مظاہر ہوتے ہیں مثلاً کشادہ قلبی، حلم ودرگزر میں وہ اللہ کی صفت غفار کا پَرتو ہے، اور دین کے سلسلہ میں شدت اور باطل پر غضب میں وہ اللہ کی صفت قہار کا پَرتو ہے اور پاکیزگی میں صفت قدوس کا مظہر ہے وغیرہ:ـ

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

حسنِ اخلاق کی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ وہ دلوں کو فتح کرتا ہے اور طوفانوں کے رخ موڑ دیتا ہے، تاریخ اس محیر العقول تاثیر کے نمونوں سے پر ہے، فتح مکہ کے موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مشرکین مکہ کے ساتھ حسن اخلاق اور عفو ودرگذر کا معاملہ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ لوگ جوق درجوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے اور کایا پلٹ گئی۔

اخلاق کی طاقت نے ہر دور میں بے شمار معرکے سر کئے ہیں، لاتعداد موقعوں پر سربلند

کیا ہے، دعوت اسلامی کا کارواں ہر دور میں اسی طاقت کے ذریعہ تیز رفتار رہا ہے، قوموں کے عروج وزوال کے پس منظر میں اخلاقی بلندی وپستی کا اہم رول ہوتا ہے، اخلاقی بے راہ روی اور گراوٹ زوال وادبار کی پیغامبر ہوتی ہے اور اخلاقی پاکیزگی، رفعت، ترقی وعروج کی ضامن۔

امتِ اسلامیہ تاریخ کے ہر دور میں اخلاقی قوت سے مالا مال رہی ہے، اس وقت بھی یہ قوت موجود ہے اگرچہ مختلف النوع موانع اس قوت کے لیے سدّ راہ بنے ہوئے ہیں، تاہم تاریکی کی اوٹ سے روشنی جھلکتی نظر آتی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ ان موانع کا مقابلہ کیا جائے اور ہر قیمت پر اخلاقی قوت کو ضائع ہونے سے بچایا جائے اس لئے کہ اخلاقی قوت سے محروم قومیں تمام تر عسکری ودیگر قوتوں سے لیس ہونے کے باوجود بالآخر ناکام ہوتی ہیں، اسلام نے ہر شعبۂ زندگی میں اخلاقی خوبی کو اپنانے کا حکم دیا ہے اور اسی پر عمل کر کے اس دور کا مسلمان اپنی مشکلات سے نجات پا سکتا ہے اور تمام حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے، اگرچہ وہ بے خیل وسپاہ ہے لیکن وہ حکمرانوں سے بھی زیادہ عالی ظرف اور بادشاہوں سے بھی زیادہ بلند نگاہ ہے، اور اگر وہ مطلوبہ اوصاف واخلاق کو اپنا لے اور اسے اس کا مقام دیدیا جائے تو وہ انقلاب برپا کر سکتا ہے اور اس کا جمالِ جہاں افروز، جلالِ عالم سوز کی صورت میں جلوہ گر ہوسکتا ہے، بقول اقبال مرحوم:

مسلماں گرچہ بے خیل و سپاہے است
ضمیر او ضمیر بادشاہے است

اگر او را مقامش باز بخشند
جمالِ او جلالِ بے پناہے است

اعلیٰ انسانی کردار

صاحب ایمان بندوں کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ناموافق سے ناموافق حالات میں انتہائی جذباتی صورتِ حال میں بھی دین اور کتاب وسنت کا حوالہ آنے پر بالکل خاموش ہوکر سرِ تسلیم خم کردیتے ہیں، پھر انہیں اپنے مادی، دنیاوی منافع اور نقصانات کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرام اس خصوصیت میں انتہائی نمایاں مقام رکھتے تھے، ان کے اوصاف میں ''وَقَّافِيْنَ عِنْدَ كِتَابِ اللّٰهِ'' (قرآن کا حوالہ آتے ہی بالکل رک اور ٹھہر جانے والے) کا وصف بہت اجاگر ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا واقعہ ہے کہ عیینہ بن حصن مدینہ آئے اور اپنے برادرزادے الحرّ بن قیس کے گھر پر مقیم ہوئے، الحرّ بن قیس ان افراد میں تھے جنہیں حضرت عمرؓ اہمیت دیتے تھے، وہ ان کے مقرب مشیر تھے، عیینہ نے اپنے بھتیجہ سے کہا: تم کو امیر المؤمنین سے قربت حاصل ہے، میری اُن سے ملاقات کرادو، حضرت حرّ نے امیر المؤمنین سے اپنے چچا کے لئے وقت چاہا، ملاقات ہوئی، عیینہ حضرت عمر کے پاس آئے تو بڑی بے ادبی سے بولے: اے خطاب کے بیٹے! خدا کی قسم! تم ہمیں نہ تو کچھ مال دیتے ہو اور نہ ہمارے بیچ انصاف کرتے ہو، حضرت عمرؓ کو یہ بات سن کر غصہ آ گیا، حضرت حر نے فوراً عرض کیا: اے امیر المؤمنین! اللہ نے قرآن میں اپنے نبی کو حکم دیا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ. (الاعراف: ۱۹۹)

ترجمہ: درگذر کیجئے اور نیکی کا حکم دیجئے، اور جاہلوں سے اعراض کیجئے۔

اے امیر المؤمنین! یہ آدمی جاہلوں میں سے ہے، اس سے اعراض کیجئے اور نظر انداز

کر دیجئے، راوی کا بیان ہے کہ قرآن کی آیت سنتے ہی حضرت عمر بالکل رک گئے۔

وَاللّٰهِ مَا جَاوَزَهَا عُمَرُ حِيْنَ تَلاهَا عَلَيْهِ، وَكَانَ وَقَّافاً عِنْدَ كِتَابِ اللّٰهِ. (صحيح بخاری: كتاب التفسير)

ترجمہ: بخدا قرآن کی یہ آیت جوں ہی پڑھی گئی حضرت عمر تھم گئے اور ذرا بھی تجاوز نہیں کیا، قرآن کا نام آتے ہی وہ بالکل رک جایا کرتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثۂ وفات کا صدمہ اس قدر دل دوز تھا کہ بہت سے صحابہ فرطِ تحیر و تعجب سے بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا تھے، حضرت عمر پر یہ کیفیت بہت بڑھی ہوئی تھی، روایات میں آتا ہے کہ وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ’’بہت سے منافق یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کی وفات ہوگئی، خدا کی قسم آپ کی وفات نہیں ہوئی ہے؛ بلکہ آپ اپنے رب کے پاس گئے، جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام گئے تھے، چالیس دن تک قوم کے پاس نہ تھے، پھر لوٹ آئے تھے، خدا کی قسم! آپ بھی اسی طرح لوٹ آئیں گے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام لوٹ آئے تھے، صورتِ حال بے حد نازک تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خبر ملی تو تشریف لائے، مسجد نبوی کے دروازے پر اُترے، کسی سے کچھ بولے بغیر سیدھے آپ کے حجرے میں گئے، آپ کے رخِ انور سے چادر ہٹائی، اُسے بوسہ دیا اور رونے لگے، پھر فرمایا: میرے ماں باپ آپ پر قربان! اللہ نے جو موت آپ کے لئے مقدر فرما دی تھی وہ آچکی، اب کوئی اور موت نہیں آنے والی ہے، اُس کے بعد باہر آئے، حضرت عمر فرطِ صدمات سے بولے جارہے تھے، انہیں چپ کرانا چاہا، مگر وہ چپ نہ ہوئے، صحابہ حضرت ابوبکر صدیق کی طرف متوجہ ہوئے، حضرت ابوبکر نے خطاب شروع کر دیا، اور فرمایا:

مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَإِنَّ مُحَمَّداً قَدْ مَاتَ، وَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ، قَالَ اللّٰهُ: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى

أَعْقَابِكُمْ، وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئاً، وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشَّاكِرِيْنَ. آل عمران: ١٤٤﴾

ترجمہ: تم میں سے جو شخص محمدؐ کی پوجا کرتا تھا وہ جان لے کہ محمدؐ کی موت واقع ہوچکی ہے، اور تم میں سے جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو یقیناً اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، اُسے کبھی موت نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں، اب اگر ان کی موت واقع ہوجائے یا وہ قتل کردیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے، جو شخص الٹے پاؤں پلٹ جائے وہ اللہ کو ہرگز کچھ نقصان نہیں پہنچا سکے گا، اور اللہ شکر کرنے والوں کو بدلہ دے گا۔

صحابہ جواب تک غم وحزن کے افراط سے حیرت میں تھے، حضرت ابوبکر کا یہ خطاب سن کر انہیں یہ یقین آ ہی گیا کہ آپ واقعی وفات پا چکے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بیان ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ نے یہ آیت پڑھی تو ایسا لگا جیسے لوگ یہ جانتے ہی نہ تھے کہ قرآن میں یہ آیت بھی نازل ہوئی ہے، اب ان سے سن کر سب کی زبان پر یہی آیت آ گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بیان کرتے ہیں کہ جب میں نے ابوبکر کو یہ آیت پڑھتے سنا تو دہشت کی وجہ سے زمین پر گر پڑا، میرے پاؤں اپنا بوجھ نہ اٹھا سکے، اور مجھے یقین آ گیا کہ آپ کی وفات ہوچکی ہے۔ (سیرت ابن ہشام ۴/۱۳۳۴لخ)

سمجھا جا سکتا ہے کہ یہی حضرت عمر انتہائی جوش اور غضب کے عالم میں کسی بھی طرح چپ ہونے کو تیار نہ تھے؛ لیکن قرآن کی ایک آیت سنتے ہی وہ بالکل ساکت ہوگئے اور یک لخت تھم گئے، انتہائی ہیجانی حالات میں بھی قرآن کی ایک آیت سنتے ہی بالکل خاموش ہوجانا، سر تسلیم خم کردینا اور اپنے جذبات کو زیر کردینا انسان کی عظمت کا سب سے بلند معیار

وکردار ہوتا ہے، اختلافات کے باوجود عدل کی ڈگر پر قائم رہنا، انا زخمی ہونے کے باوجود تحمل وصبر کی روش اپنائے رکھنا، تحقیر واہانت کے باوجود انتقام کی نفسیات سے پاک رہنا اور عین اشتعال وجذباتیت کے ماحول میں ضبط اور سکون کی کیفیت برقرار رکھنا انتہائی اعلیٰ وارفع اوصاف واخلاق ہیں، صحابہ کی سیرت ان اوصاف کے سیکڑوں مظاہر اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہے اور رہتی دنیا تک مشعلِ راہ ہے، اور یہ پیغام دے رہی ہے کہ ان اوصاف کو جب تک مزاج بنانے کی فکر نہیں پیدا ہوگی، عظمت اور فلاح کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

مصنف کی مطبوعہ علمی کاوشیں

● اسلام میں عفت وعصمت کا مقام

یہ کتاب عفت وعصمت کے موضوع پر انتہائی تفصیلی اور اہم پیش کش ہے، اپنے مندرجات کی جامعیت اور نصوص کی کثرت کی بنیاد پر اپنے موضوع پر اردو زبان میں انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، ملک وبیرونِ ملک کے اکابر علماء کے تأثرات وتقریظات سے آراستہ ہے۔ مختصر سے عرصہ میں اس کے پانچ ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں، یہ کتاب بجا طور پر اس قابل ہے کہ عوام وخواص، علماء وعوام، مرد وعورت سبھی اس کو اپنے مطالعہ میں رکھیں۔

● بیانات سیرت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کتاب موجودہ حالات میں سیرت نبویہ کے فکر انگیز پیغام اور گوشوں کو واضح کرنے والی مکمل، مدلل، مرتب، جامع اور موثر سیرت طیبہ سے متعلق چار مفصل بیانات پر مشتمل ہے، اور قرآن وحدیث کی روشنی میں حسن ترتیب کے ساتھ پوری سیرت کو اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، عوام وخواص ہر ایک کے لئے یکساں طور پر افادیت کی حامل اور قابل مطالعہ ہے۔

● اسلام میں صبر کا مقام

یہ کتاب صبر کے موضوع پر ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، فاضل مصنف نے اس کتاب میں جدید اسلوب میں قرآن وحدیث، آثار صحابہ کی روشنی میں صبر کے مقام، اس کی اہمیت اور ضرورت کے متعدد پہلوؤں کو کافی شرح وبسط کے ساتھ واضح کیا ہے، صبر وشکر کے تقابلی تجزیے پر مصنف نے بے حد قیمتی باتیں تحریر کی ہیں، دور حاضر کے ہر نوجوان کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

● ترجمان الحدیث

اس کتاب میں اصلاح معاشرہ اور تعمیر سیرت واخلاق کے متعلق ڈیڑھ سو صحیح ترین احادیث نبویہ کی مدلل اور عام فہم اسلوب میں عالمانہ تشریح کی گئی ہے۔ یہ کتاب بجا طور پر اس قابل ہے کہ اپنے مواد کی علمیت اور افادیت کی وجہ سے اسے مساجد اور اجتماعی مجالس میں سنایا اور پڑھایا جائے۔

● اسلام کی سب سے جامع عبادت نماز

اس کتاب میں نماز کی اہمیت، اقسام وانواع، خشوع کی شرعی حیثیت، خشوع کے مختلف طریقوں کا ذکر قرآن وسنت کی روشنی میں بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ خشوع کے موضوع پر جو فاضلانہ اور عالمانہ مفصل ومدلل بحث کی گئی ہے وہ اردو دنیا میں اپنی نوعیت کی منفرد چیز ہے، یہ کتاب ہر خاص وعام کے مطالعہ میں جگہ پانے کی اولین مستحق ہے۔

● اسلام اور زمانے کے چیلنج

موجودہ معاصر حالات کے تناظر میں مصنف کے اشہب قلم سے نکلی ہوئی پرسوز، پردرد اور واقعیت پسندی پر مبنی فکری تحریروں کا یہ مجموعہ موجودہ صورتِ حال میں ہر مسلمان کے لئے راہبر اور فکری غذا فراہم کرتا ہے، جو بات بھی لکھی گئی ہے باحوالہ اور نصوص کی روشنی میں ہے۔

● سیرتِ نبویہ قرآنِ مجید کے آئینے میں

یہ کتاب قرآن کی روشنی میں سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جامع اور روشن پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، قرآنی سیرت کے موضوع پر یہ اردو زبان میں پہلی باضابطہ کتاب ہے، جس میں سیرت طیبہ کو تاریخی ترتیب کے ساتھ قرآنی بیان کے آئینہ میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، اسلوبِ بیان بے حد پرکشش اور اچھوتا ہے۔ کتاب کے متعدد ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔

● عظمتِ عمر کے تابندہ نقوش

یہ کتاب عربی کے مشہور ادیب شیخ علی طنطاوی کی پراثر تحریر "قصة حياة عمر" کی ترجمانی ہے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مقدمے سے مزین ہے، کتاب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عظمت وعبقریت کے نمایاں پہلو بہت دل نشیں اور ساحرانہ اسلوب میں اجاگر کئے گئے ہیں، سیرتِ عمر پر یہ کتاب عمدہ اور قابل قدر اضافہ ہے۔

● گناہوں کی معافی کے طریقے اور تدبیریں

یہ کتاب صحیح ترین احادیث نبویہ کی روشنی میں گناہوں کی معافی کے مختلف طریقوں کو محیط ہے، اس میں گنہ گاروں کو مایوسی سے بچنے کی تاکید اور توبہ کی تحریک اور عمل صالح کی ترغیب ملتی ہے، ہر مسلمان نوجوان کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔

● گلہائے رنگارنگ

تین جلدوں پر مشتمل یہ وقیع کتاب قرآن وسنت کی انقلابی تعلیمات، اصلاحِ قلب ونفس ومعاشرہ، اسلام کے خلاف پھیلائے گئے مغالطّوں اور شکوک وشبہات کی مکمل اور مدلل تردید کو محیط عام فہم اور دل نشیں اسلوب میں بیش قیمت اور فکرانگیز تحریروں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن بہت جلد مقبول ہوا، اب دوسرا ایڈیشن زیرطباعت ہے۔

● مفکر اسلام؛ جامع کمالات شخصیت کے چند اہم گوشے

یہ کتاب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نور اللہ مرقدہٗ کی حیات وخدمات اور ان کی تابندہ زندگی کے روشن نقوش اور نمایاں امتیازات کی جامع اور مکمل تصویرکشی ہے۔ کتاب حضرت مولانا انظر شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن صاحب اعظمی مدظلہ کے بیش قیمت مقدمات سے مزین ہے، متعدد اہل قلم کے تأثر کے مطابق مفکر اسلام کی شخصیت پر لکھی جانے والی کتابوں میں یہ کتاب اپنے مواد کی جامعیت، اسلوب کی دل کشی اور حسن بیان کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتی ہے۔

● علوم القرآن الکریم

یہ کتاب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی کی اردو تصنیف علوم القرآن کا عربی ترجمہ ہے۔ مترجم نے بہت سلیس اور شگفتہ عربی زبان میں کتاب کو اردو سے منتقل کیا ہے، شروع میں حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ کا مقدمہ زینت کتاب ہے۔

● اسلام میں عبادت کا مقام

یہ کتاب عبادت کے موضوع پر انتہائی جامع اور محیط کتاب ہے، جس میں عبادت کے تمام پہلوؤں کا کتاب وسنت اور اقوال سلف کی روشنی میں تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ عوام اور خواص سب کے لئے یکساں مفید ہے۔

● اسلام دین فطرت

یہ کتاب مذہب اسلام کے امتیازات اور اس کی انسانیت نواز تعلیمات کو واضح کرتی ہے، اس میں اسلام کی جامعیت، واقعیت، حقیقت پسندی، ربانیت، امن واسلامتی، اخوت ووحدت، مساوات واجتماعیت جیسے متعدد اہم گوشوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ہر باذوق کے لئے قابل مطالعہ ہے۔

● دیگر کتب:

اختر تاباں (تذکرہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحبؒ)
والد ماجد (تذکرہ حضرت مولانا محمد باقر حسین صاحبؒ)
شیخ الہند: حیات، خدمات وامتیازات
مقام صحابہ اور غیر مقلدین
اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روشن عناوین
سچ اور جھوٹ کتاب وسنت کی روشنی میں ایک جائزہ
اسلام کا جامع اور مؤثر ترین تعزیری نظام
کچھ یادیں کچھ باتیں (تذکرہ حضرت مولانا مفتی محمد افضل حسین صاحبؒ)
اسلام اور دہشت گردی
بنیادی دینی اور تاریخی معلومات (اردو، ہندی)
منشیات اور شراب: اسباب ومحرکات، شرعی ہدایات، سدباب کی تدبیریں

● عربی کتب:

❍ وان المساجد للہ ❍ لمعات من الاعجاز القرآني البديع
❍اصول المعاش الاسلامی فی ضوء نصوص الکتاب والسنة......
❍نظرة عابرة على القضاء والقضاة فی الاسلام ❍ بحوث علمية فقهية